طلوعِ اسلام

مئی ۱۹۵۲

صحیح انتخاب اس وقت ہو سکتا ہے

جب آپ کے سامنے انتخاب کے لئے قسم قسم کا مال موجود ہو اور

خریداری کا فیصلہ

اس وقت ہو سکتا جب آپ تسلی کر لیں کہ قیمت واجبی ہے۔ اور

آپ کا اطمینان

اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خرید کردہ مال کے استعمال کے بعد دیکھ لیں کہ جیسا کہا گیا تھا، مال ویسا ہی نکلا۔

آپ یونہی پریشان نہ ہوجئے

ہمارے ہاں آیئے اور دیکھئے کہ مذکورہ بالا شرائط کے مطابق آپ کا اطمینان ہوتا ہے یا نہیں۔
ہمارے ہاں —— ہر قسم کا ہوزری کا سامان، ٹائیلٹ کے لوازمات، اون، گرم کپڑا، ٹیلرنگ (صرف جنٹس کے لئے) تحفہ جات اور دیگر متفرق اشیائے ضروریات کا بہت بڑا اسٹاک موجود رہتا ہے۔

تھوک کے لئے — سمرسیٹ سٹریٹ، کراچی

پرچون کے لئے — الفنسٹن سٹریٹ، کراچی

تشریف لائیے

نیاز آگین: ایچ غلام محمد اینڈ برادرز، کراچی

نشانِ مردِ مومن با تو گویم

تقسیمِ ہند کے بعد تھوڑے ہی دن بعد کا واقعہ ہے، ایک عزیز نے مجھ سے کہا کہ کراچی کے کلکٹر یہ سن کر بہت خوش ہوئے کہ تم یہاں آ گئے ہو۔ وہ دیر تک معارف القرآن اور طلوعِ اسلام کی باتیں کرتے رہے۔

کچھ دنوں بعد میں شام کے وقت باہر سے آیا تو دور سے دیکھا کہ کوئی صاحب میرے ہاں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہیں۔ ان کا چہرہ سامنے سے نہیں، ایک سمت سے مجھے دکھائی دے رہا تھا اور میری آنکھوں کے سامنے رہ رہ کر حضرت علامہ اقبالؒ کی تصویر آ رہی تھی۔ یہی تھے کراچی کے کلکٹر، خاں صاحب محمد اسحٰق بدرالدین۔ پہلی ہی ملاقات میں ایسا محسوس ہوا گویا برسوں کے بچھڑے ملے ہیں۔ میں حیران تھا کہ قلب و نگاہ کی آہنگی کس طرح غائبانہ یگانگت پیدا کر دیتی ہے۔

اس کے بعد اس تمام عرصے میں یہ کیفیت رہی کہ وہ میری تحریروں کا ایک ایک لفظ نہایت غور و فکر سے پڑھتے۔ جہاں اختلاف ہوتا، ایک بزرگانہ شفقت کی ڈانٹ سے اس پر متنبہ کرتے۔ اور جب میرے بیان سے بات واضح ہو جاتی تو ہمیشہ لپک کر گلے لگا لیتے۔ لوگ انھیں صرف ایک قابل منتظم اور دیانتدار اور ہمدرد افسر کی حیثیت ہی سے پہچانتے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ قدرت نے انھیں کسقدر ذہنِ رسا، قلبِ سلیم، نگہِ پاک، احساسِ عمیق اور فکرِ بلند عطا کیا تھا۔ اقبال کے شاگرد بھی تھے اور نہایت عقیدتمند بھی۔ ان کا ذکر چھڑ جاتا تو کیف و جذب کے عالم میں گھنٹوں باتیں سناتے رہتے۔ بڑی پر لطف اور معنی خیز۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع۔ فلسفے اور تاریخ پر گہری نگاہ۔ قرآن سے بڑا لگاؤ۔ اور حضور رسالت مآبؐ سے والہانہ عشق تھا۔

۸ اپریل، منگل کی شام میرے ہاں تشریف لائے لیکن میں مکان پر موجود نہ تھا (اس کا مجھے اب عمر بھر افسوس رہے گا)۔ صبح اطلاع ملی کہ ان کی طبیعت اچانک ناساز ہو گئی ہے۔ دو دن کی مختصر سی علالت کے بعد یکسر خلاف توقع، جمعہ کی صبح انتقال کر گئے۔

میرا دل اب عمر بھر ان کی کمی محسوس کرتا رہے گا۔ اس محبت سے اقبال کی باتیں سنانے والا۔ اس غور و فکر سے قرآن کی باتیں سننے والا۔ اس عشق و عقیدت سے ذاتِ رسالتمآبؐ کا نام لینے والا۔ اس بزرگانہ شفقت سے ٹوکنے والا اور اس وسعتِ قلب سے اعترافِ حقیقت کر لینے والا، اب شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے
سراپا درد ہوں حسرت بھری ہے داستاں میری

پرویز

اسلامی حیاتِ اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	مُرتّب	بدل اشتراک
دس آنے (پاکستانی)	محمد یونس	سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)
بارہ آنے (ہندوستانی)		غیر ممالک سے ۱۲ شلنگ

جلد ۵	مئی سنہ ۱۹۵۲ء	نمبر ۵

فہرستِ مضامین

نشانِ مردِ مومن با تو گویم (محترم پرویز صاحب)	۳	اسلامی نظام (محترم پرویز صاحب)	۴۷-۵۹
لمعات	۵-۱۳	بشریتِ رسول (محترم نذر الباقر صاحب)	۶۰-۶۴
ضربِ کلیم (ڈاکٹر عزام بے صاحب۔ محترم پرویز صاحب)	۱۴-۲۵	حقائق و عبر	۶۵-۶۷
پیغامِ اقبال اور ہم (نظم) (محترم اسد ملتانی صاحب)	۲۶	اشتہارات	۶۸-۷۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

تصوف کی کتابوں میں ایک قصہ پڑھا کرتے تھے کہ ایک بزرگ نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ ایک نہایت مقدس، خضر صورت بزرگ تشریف لائے ہیں اور ان سے کہہ رہے ہیں کہ تم آرام سے سو رہے ہو اور اس دفعہ حج اکبر ہے۔ اس میں شامل کیوں نہیں ہوتے؟ سونے والے نے اس مشفق و مکرم کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا اور اٹھکر اپنے عازمِ حج ہونے کا اعلان کر دیا۔ ان کے ہزارہا مریدوں نے جب یہ سنا تو وہ سب کارواں در کارواں اپنے مرشد کی معیت میں، حجِ اکبر کے لئے تیار ہو گئے۔ اس بزرگ کے پیر نے جب یہ سنا تو اس سے پوچھا کہ تم یہ کیا کر رہے ہو؟ اس نے اپنے خواب کا ماجرا سنایا تو انھوں نے کہا کہ تمہیں کچھ خبر بھی ہے کہ وہ "مقدس بزرگ" کون ذات شریف تھے! وہ شیطان تھا جو تمہیں بہکانے کیلئے آیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ شیطان کا کام تو ہمیشہ نیک کاموں سے روکنے کا ہے۔ وہ مجھے حج اکبر میں شمولیت کی تلقین کیوں کریگا؟ پیر نے کہا کہ خلیفۂ وقت نے جہاد کا اعلان کیا ہے اور شیطان نہیں چاہتا کہ مسلمان اس میں شریک ہوں۔ اس لئے وہ انھیں اس قسم کے "نیک کاموں" میں الجھاتا پھر رہا ہے۔

یہ قصہ حقیقت ہو یا تمثیلی افسانہ، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ہے ابلیسی فریب کاریوں اور روباہ بازیوں کا نہایت لطیف مرقع۔ ابلیس اپنے اصلی خط و خال میں بہت کم دھوکہ دے سکتا ہے۔ اس کی کامیابی کا راز وہ مقدس نقاب ہیں جن میں چھپکر وہ غارت گرِ دین و دانش ہوتا ہے۔ اسی قسم کا ایک مقدس نقاب ہے جس میں چھپکر، افرنگ کی ابلیسی سیاست آجکل مسلمانانِ عالم کیلئے رہزنِ ایمان و ہوش ہو رہی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ گذشتہ عالمگیر جنگ، اقوامِ یورپ (بشمولیتِ امریکہ) کیلئے ایک بہت بڑے مقابلے کا میچ تھا جس میں ہر ٹیم جان کی بازی لگا کر شریکِ نبرد آزمائی تھی۔ اس میچ میں آخر الامر روس اور دوسری طرف برطانیہ اور امریکہ (SEMI-FINAL) میں آ گئے ہیں۔ اب یہ ٹیمیں فائنل میچ کی تیاریاں کر رہی ہیں۔ اور اگلی جنگ ان کے درمیان فیصلہ کن مرحلہ ہوگی۔ اس کے بعد یا تو ساری دنیا پر روس کا تسلط ہوگا اور یا "برطانوی۔ امریکی" بلاک غالب آجائے گا۔ روس کے پاس ایک پیغام[1] ہے اور اس کے پیغام رساں ساری دنیا میں مصروفِ کار ہیں۔ ــــ یہ پریشان روزگار، آشفتہ مغز، آشفتہ ہو، ادعائے لامذہبیت کے باوجود، ایک "مذہبی دیوانگی" کے ساتھ اپنے پیغام کی تبلیغ میں پیکرِ جذب و انہماک بنے، مصروفِ تگ و تاز رہتے ہیں۔ "برطانوی۔ امریکی بلاک" کے پاس پیغام کوئی نہیں۔ اسلئے وہ اپنے حلیفوں کی تعداد بڑھانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ اس باب میں ان کی نظر سب سے پہلے مسلم ممالک پر ہے جن کی جغرافیائی پوزیشن اس فائنل میچ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ امریکہ کے پاس سونے کا سمندر ہے جس سے وہ ان ممالک کے اوپر کے طبقے کو جسوقت چاہے خرید سکتا ہے۔ لیکن اس کے سامنے گذشتہ

---

[1] ہمیں اسوقت اس پیغام کے حسن و قبح سے بحث نہیں۔ اس وقت صرف کہنا یہ ہے کہ اس کے پاس ایک پیغام ہے، جس کے ذریعہ وہ اپنا اثر دور دور ممالک میں پھیلا رہا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ۔ برطانیہ بلاک کے پاس کوئی پیغام نہیں ہے۔

ایک آدھ صدی کی تاریخ کے ایسے سبق ہیں جن کی موجودگی میں وہ اس قسم کا سطحی سودا کچھ زیادہ منفعت بخش تصور نہیں کرتا۔ اس نے دیکھا ہے کہ مغربی اقوام نے اپنی وسیع کاریوں کیلئے اسلامی ممالک میں مختلف تحریکیں چلائیں۔ انھوں نے ان تحریکوں کی کامیابی کے لئے اوپر کے طبقے کو ساتھ ملایا لیکن نتیجہ ہمیشہ یہ رہا کہ کچھ وقت کے بعد نیچے کے طبقے (عوام) نے ان تحریکوں کو ناکام بنا دیا۔ اب "برطانوی۔ امریکی بلاک" اس تجربہ شدہ طریق کار کو دہرانا نہیں چاہتا۔ وہ اپنی مقاصد براری کیلئے چاہتا یہ ہے کہ کوئی ایسی تحریک شروع کی جائے جو براہِ راست عوام کو اپیل کرے۔ مسلمان عوام مذہب پرست ہیں اور جذباتی (یہ دونوں چیزیں ہیں بھی لازم و ملزوم۔ مذہب کا دارومدار ہوتا ہی جذبات پر ہے۔ یہ تو فقط دین ہے جو بصیرت اور جذبات کے نہایت متوازن امتزاج سے فلاح و سعادت کی راہیں کھولتا ہے)۔ خدا کا نام ان کے جذبات کو مشتعل کرنے کیلئے کافی ہے۔ مدبرین یورپ یہ بھی دیکھ چکے ہیں (اور دیکھ رہے ہیں) کہ خود مسلمانوں کا اوپر کا طبقہ کس طرح خدا کے نام پر عوام کے جذبات سے کھیلتا اور انھیں اپنی مفاد پرستیوں کیلئے آلۂ کار بناتا ہے۔ لہٰذا برطانوی۔ امریکی بلاک نے سمجھ لیا کہ مسلم عوام میں اگر کوئی تحریک کامیاب ہو سکتی ہے تو وہ خدا کے نام پر ہی ہو سکتی ہے۔ دوسری طرف اِن کی خوش قسمتی سے روس خدا کا منکر ہے۔ لہٰذا ان کی تحریکِ جدید کی چولیں نہایت ٹھیک بیٹھ رہی ہیں۔ روس نے کہا تھا کہ

دنیا کے مزدورو! اپنا متحدہ محاذ قائم کرو۔

کس کے خلاف؟ روس کے حریفوں کے خلاف!

برطانوی۔ امریکی بلاک نے اس کے مقابلے میں یہ سلوگن (نعرہ) وضع کیا ہے کہ

دنیا کے خدا پرستو! اپنا متحدہ محاذ قائم کرو۔

کس کے خلاف؟ روس کے خلاف!

غور کیا آپ نے کہ "خدا" سے کیا کام لیا جا رہا ہے؟ سچ کہتے ہیں کہ خدا "بڑا مسبب الاسباب" ہے۔ وہ "ڈوبتوں کا سہارا" ہے۔ وہ "مشکل کشا اور دستگیر" ہے۔ اس بلاک کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ روس کے پیغام کا کیا جواب ہو سکتا ہے؟ اس بیچارگی اور بے بسی کے عالم میں "خدا" کام آ گیا۔ وہی "خدا" جس کے متعلق مارکس نے کہا تھا کہ وہ سرمایہ داروں کے ہاتھ میں عوام کیلئے افیون ہے۔ دیکھا آپ نے کہ یہ کتنا بڑا مقدس نقاب ہے جسے اوڑھ کر شیشہ گرانِ فرنگ کی ابلیسی سیاست اپنی مطلب براری کیلئے میدان میں آئی ہے! اس بلاک نے اس تحریک کو (حسب معمول) نہایت منظم طریق پر چلا رکھا ہے۔ یورپ کے بڑے بڑے سائنٹسٹ اور مفکر جو کل تک طبیعیاتی انکشافات اور فلسفیانہ تحقیقات کی رو سے ثابت کیا کرتے تھے کہ خدا کا وجود محض ذہنِ انسانی کی تخلیق ہے اور کارگہِ کائنات میں خدا کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ سب اپنی تحریروں میں نہایت غیر محسوس طریق پر اب یہ لکھتے جا رہے ہیں کہ خدا کا وجود ایک حقیقتِ ثابتہ ہے اور اس کے بغیر یہ کائنات ایک ثانیہ کیلئے بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس پیغام کو رٹتے ہوئے ان کے "سیاسی پادری" تمام عالمِ اسلام میں پھیل رہے ہیں اور مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں کہ ہم اور آپ ایک ہی خدا کے نام لیوا ہیں اس لئے آؤ! دہریت اور خدا فراموشی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ کرنے کیلئے اٹھ کھڑے ہو اور ایک متحدہ محاذ بنا کر اپنے ایمان کی حفاظت کرو۔

ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ محض قیاس نہیں۔ اس کی تائید میں واقعاتی شہادات موجود ہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب' اپنے مقالہ "اساسِ اسلام" میں ایک اسی قسم کے واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں؛

> حال ہی میں سویڈن سے ایک مشہور اخبار کا نمائندہ پاکستان میں فقط اس غرض سے آیا کہ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ اسلام کا نظریۂ حیات کیا ہے اور اس نظریۂ حیات پر کس طرح ایک ترقی پسند اور مہذب و متمول مملکت کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ وہ مجھ سے ملا اور مجھ سے کہا کہ میں موحد ہوں اور دہریت کو غلط سمجھتا ہوں۔ مغرب کی مادیت' دہریت اور مادی اشتراکیت سے بیزار ہوں۔ میں نے اس کو اسلام کا نقطۂ نظر علم و عمل' اور جماعت و مملکت کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی۔ اس کو سن کر اس نے کہا کہ ہم جیسے عیسائیوں اور تم جیسے مسلمانوں میں کیا فرق ہے۔ خدا کے بارے میں ہم ایک ہی عقیدہ رکھتے ہیں اور اعمالِ صالحہ کی بابت بھی ہم بہت کچھ متفق ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی تمام موحد جماعتیں یا افراد ایک متحدہ محاذ دہریت اور مادیت کے خلاف قائم کریں۔ ہم میں اور تم میں دین اور اخلاق کی باتیں تو مشترک ہیں۔ کیا ہم اس اشتراکِ عقائد کی بنیاد پر اشتراکِ عمل پیدا نہیں کر سکتے۔

یہ حربہ کس قدر مؤثر ثابت ہو رہا ہے اس کا اندازہ اس جواب سے لگائیے جو خلیفہ صاحب نے اس سیاسی مشنری کو دیا۔ وہ لکھتے ہیں؛

> میں نے اس کو جواب دیا کہ تم کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ اسلام نے تیرہ سو برس پیشتر یہی صلائے عام دنیا کے تمام موحدوں کو دی تھی کہ آؤ تم اور ہم توحید اور اعمالِ صالحہ کی بنا پر اشتراکِ عمل سے کام کریں۔ یہود اور نصاریٰ نے اس دعوت کو قبول نہ کیا لیکن اسلام کی طرف سے یہ صلائے عام ہمیشہ کے لئے موجود ہے۔ اگر تم اس پر لبیک کہو تو یہ عین منشائے اسلام ہے۔ ہماری طرف سے پورا تعاون ہوگا۔ کیونکہ یہ اسلام ہی کی دعوت ہے۔ ("اسلام کی بنیادی حقیقتیں" صفحہ ۲۲۶-۲۷)

سرِ دست اس سوال کو چھوڑیئے کہ اسلام نے یہود و نصاریٰ کو جو دعوتِ اشتراک دی تھی اس کی نوعیت کیا تھی۔ اور کیا اس وقت دعوتِ اشتراک دینے والوں (مسلمانوں) کی یہی پوزیشن تھی جو آج "برطانیہ۔ امریکہ" کے مقابلہ میں مسلمانانِ عالم کی ہے (یا جو سویڈن کے اس عیسائی کے مقابلے میں خلیفہ صاحب کی تھی)۔ اس وقت تو اس عیسائی موحد سے پوچھنے کی بات یہ تھی کہ کل ہی جنگِ عظیم میں جرمنی اسی قسم کا خدا پرست (بلکہ عیسائی) تھا جیسے آپ اور آپ کے دیگر حلیف تھے۔ اور اس کے مقابلے میں روس کی دہریت اور مادی اشتراکیت بھی وہی تھی جو آج ہے۔ اس وقت آپ کا جذبۂ خدا پرستی کہاں گیا تھا جو آپ نے عیسائی جرمن کا ساتھ چھوڑ کر خدا کے منکر روس کا ساتھ دیا تھا؟

پھر اس سے پوچھنے کی بات یہ تھی کہ جن مسلمانوں کے متعلق آپ آج یہ فرما رہے ہیں کہ ان میں اور آپ میں بلحاظِ عقائد و اعمالِ صالحہ کچھ فرق نہیں۔ کم از کم چھ سات سو برس سے آپ جیسے "موحدین" کی نوکِ شمشیر سے ان توحید پرستوں کے سینے چھدتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی سلطنتیں تم نے مٹائیں۔ ان کی ثروتیں تم نے چھینیں۔ ان کی عظمتیں تم نے لوٹیں۔ ان کی عزتیں تم نے خاک میں ملائیں۔ ان کی بستیاں تم نے برباد کیں۔ ان کی قبروں کے نشان تک تم نے باقی نہ چھوڑے۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جس کے ذروں کو تم نے ان کے خون سے لالہ زار نہ بنایا ہو۔ یورپ کے مرغزاروں میں' افریقہ کے صحراؤں میں' ترکستان کے پہاڑوں میں' مصر کے دریاؤں میں' ہر جگہ اور ہر مقام پر تم نے ان کے خون کی ندیاں بہا دیں۔ تم وہ ہو کہ جوشِ انتقام میں ان کے بزرگوں کی ہڈیاں تک قبروں سے نکلوا کر سپردِ دریائے شور کر دیں۔ تم وہ ہو کہ ان کے

گھروں میں سچ مچ گدھوں کے ہل چلوا دیئے۔ اگر تم ان واقعات کو قصۂ ماضی سمجھتے ہو تو انھیں چھوڑ دو، اور دیکھو یہ کہ آج بھی تم "خدا پرستوں" کی حکومتیں ان توحید پرستوں کے ساتھ کیا کچھ کر رہی ہیں۔ کیا مراکش اور تونس میں یہی توحید پرست آباد نہیں؟ کیا مصر اور فلسطین میں انہی خدا پرستوں کی آبادیاں نہیں! انھیں بھی چھوڑو۔ جس سرزمین (پنجاب) میں بیٹھکر آج تم یہ دعوتِ اشتراکِ عمل دے رہے ہو، کل ہی اس سرزمین پر جو حشر برپا کرایا گیا تھا اس کے پیچھے تم "خدا پرستوں" ہی کا ہاتھ نہیں تھا؟ اسے بھی چھوڑیئے! آج کشمیر میں جن لاکھوں انسانوں کی زندگی کو تم جہنم بنا رہے ہو کیا وہ تمہارے ہی جیسے خدا پرست نہیں ہیں؟ ان تمام خونریزیوں اور انتقام جوئیوں، ان تمام حشر سامانیوں اور ذلت آفرینیوں کے بعد "خدا پرستی" کے عقیدے کے اشتراک پر متحدہ محاذ بنانے کی دعوت دیتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ تو سوچے کھائے بلی حج کو چلی! جو ہاتھ تم آج یوں مصافحے کے لئے بڑھا رہے ہو، دیکھتے نہیں کہ اس ہاتھ سے ابھی تک ہمارے خونِ ناحق کے قطرے کس طرح ٹپ ٹپ زمین پر گر رہے ہیں! کل تک ہم تمہارے "خدا" اور اس "خدا کے اکلوتے بیٹے" کے بدترین دشمن تھے۔ آج ہم اُس خدا کے پرستار قرار پا رہے ہیں، کل تک جو ہاتھ ہماری رگِ جان پر تھا (اور آج بھی ایک ہاتھ وہیں ہے) آج وہ ہاتھ اشتراکِ عمل کے لئے بڑھ رہا ہے۔ اقبال نے پیرس کی مسجد کی تعمیر پر جو کچھ کہا تھا وہ آج بھی حرفاً حرفاً دہرایا جا سکتا ہے۔ اس کے دلِ دردمند نے پکارا تھا کہ

میری نگاہ کمالِ ہنر کو کیا دیکھے — کہ حق سے یہ حرمِ مغربی ہے بیگانہ
حرم نہیں ہے فرنگی کرشمہ بازوں نے — تنِ حرم میں چھپا دی ہے روحِ بت خانہ
یہ بت کدہ انہی غارت گروں کی ہے تعمیر — دمشق ہاتھ سے جن کی ہوا ہے ویرانہ

دوسری طرف اِن دعوتِ اشتراک دینے والوں کے مخاطبین (مسلمانانِ عالم اور ان کے مذہبی اور سیاسی راہ نماؤں) کو دیکھئے۔ ان میں سے ان لوگوں کو چھوڑ دیجئے جو برطانیہ۔ امریکی بلاک کے دانستہ آلۂ کار بن کر "روس کی دہریت" کے جلی عنوان کے نیچے، اسلام کو سرمایہ داری، جاگیرداری اور زمینداری کا نظام ثابت کرنے کی "مقدس" کوششوں میں مصروفِ عمل ہیں۔ لیجئے صرف ان لوگوں کو جو دیانت داری سے یہ سمجھتے ہیں کہ روس اور امریکی بلاک کی جنگ درحقیقت خدا کے انکار اور خدا کے اقرار کی جنگ ہے۔ یہ بحث بہت طویل ہے کہ قرآن کی رو سے خدا کے اقرار کے معنی کیا ہیں اور کیا ہر وہ شخص جو یہ کہدے کہ وہ خدا کو مانتا ہے، قرآنی تصورِ ایمان کے مطابق خدا کا ماننے والا تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ قرآن میں تھوڑا سا تدبر بھی اس حقیقت کو بے نقاب کر دے گا کہ اس کے نزدیک خدا کا ایک مخصوص تصور ہے اور وہ (باقی چیزیں چھوڑ کر محض) اس تصور کے اعتبار سے بھی باقی "خدا پرست" اقوام سے الگ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔ اسی لئے قرآن، خدا کے ماننے والوں کو بھی اسی طرح دعوتِ ایمان بالند دیتا ہے جس طرح منکرینِ خدا کو۔ وہ صاف صاف الفاظ میں کہتا ہے کہ فان اٰمنوا بمثل ما اٰمنتم بہ فقد اھتدوا۔ اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، تو یہ لوگ راہِ ہدایت پر سمجھے جائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ خدا کا وہ مخصوص تصور جو قرآن نے دیا ہے وہ بنیاد ہے جس پر اس کے تمام نظامِ معاشرہ کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ خدا پر جو ایمان اس قسم کے انسانی معاشرہ پر متفرع نہیں ہوتا، وہ ایمان، قرآن کے نزدیک ایمان ہی نہیں۔ اسی لئے وہ قرآنی تصورِ خدا کا انکار کرنے والوں کو کافر (نہ ماننے والے) کہہ کر پکارتا ہے، خواہ وہ روس کا دہریہ ہو یا برطانیہ کا عیسائی۔

ذرا سوچئے کہ جس قسم کے خدا پر ایمان کا نتیجہ یورپ کا موجودہ نظریۂ زندگی اور اندازِ معاشرہ ہو، وہ خدا، قرآن کا خدا ہو سکتا ہے؟ قرآن کے خدا پر ایمان، وحدتِ انسانی کا نظریہ عطا کرتا ہے۔ یورپ کے خدا پر ایمان، انسانیت کو قومیتوں میں بانٹ کر اس کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ آج دنیا قومیت پرستی کے جس جہنم میں جل رہی ہے وہ یورپ کے اسی "خدا" کا پیدا کردہ ہے جسے وطنیت کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اسی "خدا کی پرستش" کا نتیجہ ہے کہ آج امریکہ اور یورپ کی تمام سفید قومیں، باقی دنیا کی کالی قوموں کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ اور نہ صرف بنگاہِ نفرت دیکھتی ہیں بلکہ ان کے خون کو شیرِ مادر کی طرح غٹ غٹ کر کے پی جاتی ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کی اقوام دہریہ تو نہیں ہیں۔ یہ خدا کی ماننے والی اقوام ہیں۔ کیا یورپ کی سفید فام اقوام، ان میں اور اپنے آپ میں کوئی بھی وجۂ اشتراک دیکھتی ہیں! کیا وہ اِن اقوام کو کسی اور "خدا" کی مخلوق نہیں سمجھتیں؟ یورپ کی "خدا پرست" اقوام کے نزدیک، مستقل اقدار اور ابدی صداقتوں کا کوئی وجود نہیں۔ ہر وہ کام جس سے ان کی قومی منفعت مقصود ہو، نیکی ہے اور جس کام سے کسی غیر قوم کو فائدہ پہنچتا ہو گناہ ہے۔ ہر وہ طریق جس سے اپنی نیشن کو تقویت پہنچے جائز ہے اور ہر وہ عمل جس سے غیر قوم کی بہبود ہو ناجائز۔ کیا آپ اس نظریۂ زندگی کی حامل اقوام کو "خدا پرست" کہیں گے؟ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ قرآن اس قسم کے "خدا پرستوں" کے متعلق کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ جب ان سے پوچھئے کہ زمین و آسمان کو کس نے بنایا تو وہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ اللہ نے۔ لیکن اس کے بعد جب ان سے کہا جائے گا کہ پھر آؤ، اس اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کریں، تو وہ کنی کتراتے ہوئے نکل جائیں گے۔ قرآن نے اہل کتاب (عیسائیوں اور یہودیوں) سے یہی کہا تھا کہ جب تم خدا کا اقرار کرتے ہو تو پھر خدا کے ضابطۂ قانون سے انکار کرنے میں پیش پیش کیوں ہو؟ (ولا تکونوا اول کافر بہ) یہی وہ بنیاد تھی جس پر اس نے انہیں دعوتِ اشتراکِ عمل دی تھی۔ یعنی ان لا نعبد الا اللہ۔ کہ ضابطۂ خداوندی کے سوا اور کسی کا حکم نہ مانا جائے۔ اس کا نام قرآن کی اصطلاح میں ایمان باللہ ہے۔ نہ کہ یورپ کی عیسائی اقوام کا ایمان کہ وہ خدا کا اقرار کرتی ہیں لیکن زندگی اپنے خود ساختہ نظام و قوانین کے مطابق بسر کرتی ہیں۔ اگر خدا کا اقرار زندگی کے بنیادی تصورات میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا تو ان کا عیسائی ہونا تو ایک طرف، ان کا مسلمان ہو جانا بھی بے معنی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف علامہ اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا تھا۔

ضمیر اس مدنیت کا دیں سے خالی ہے — فرنگیوں میں اخوت کا ہے نسب پہ قیام
بلند تر نہیں انگریز کی نگاہوں میں — قبولِ دینِ مسیحی سے برہمن کا مقام
اگر قبول کرے دینِ مصطفےٰ انگریز — سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہاں تک خدا کے انکار یا اقرار کا تعلق ہے، روس کی دہریت اور برطانیہ، امریکی بلاک کے "ایمان" میں کچھ فرق نہیں۔ قرآن کے نزدیک دونوں مردود و مطرود ہیں اور اس لئے مسلمانوں کے نزدیک، سگِ زرد برادرِ شغال، دونوں یکساں ہیں۔ مسلمان کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنے ناقابلِ تبدل مستقر پر قائم ہو اور اس کے بعد دنیا کو دعوت دے کہ جو فرد یا جماعت انسانیت کو اس راہ پر لے جانے میں مدد و معاون ہونا چاہے وہ اٹھے۔ ہم اس کا تعاون بطیب خاطر قبول کریں گے۔ لیکن آج مسلمان اپنا یہ مقام

کھو بیٹھا ہے اس لئے (جیسا کہ ہر موقعہ پر کہا جاتا ہے) اسے دنیا کی بڑی بڑی قوموں میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ رہنا ضروری ہے۔

ہم نے جو کچھ اوپر لکھا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمارے نزدیک مسلمانوں کو برطانیہ۔ امریکی بلاک کی بجائے، روس کے حاشیہ نشینوں (CAMP FOLLOWERS) میں شامل ہو جانا چاہیئے۔ جو کچھ ہم نے کہا ہے اس کا مقصود فقط اتنا ہے کہ اس اہم مسئلہ کا فیصلہ کہ مسلمانوں کو اپنا رُخ کس سمت کرنا چاہیئے، روس کی دہریت اور فریق مخالف کی مزعومہ خدا پرستی کی رُو سے نہیں کرنا چاہیئے۔ اس لئے کہ اس باب میں دونوں ایک ہیں۔ دونوں اس خدا کے منکر ہیں جس کی دعوت اسلام دیتا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہیئے کہ خدا پرستی کے اُن جذبات سے الگ ہو کر جسے امریکی بلاک، اپنی مفاد پرستی کے لئے ابھار رہا ہے، اس اہم معاملہ کا فیصلہ (ON MERITS) کریں۔

مسلمانوں کیلئے کسی معاملہ کے فیصلہ کرنے کی شکل تو ایک ہی ہے کہ وہ دیکھیں کہ اس باب میں قرآن کا حکم یا اس کا اصولی منشا کیا ہے؟ لیکن فیصلہ کرنے کا یہ انداز تو ان کیلئے ہے جن کا ایمان ہو کہ من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔ جو منزل من اللہ (قرآن) کے مطابق فیصلے نہیں کرتے، ان کا شمار نہ ماننے والوں (کفار) میں ہوتا ہے۔ لہٰذا دورِ حاضر کے مسلمانوں کے سامنے یہ انداز پیش کرنا ہی خود فریبی ہے۔ دوسرا طریق وہ ہے جو دنیا کی ہر (SECULAR STATE) اختیار کرتی ہے۔ یعنی ہر معاملہ میں اپنا نفع اور نقصان سامنے رکھ کر وہ راہ اختیار کر لی جائے جو سودِ خویش کی طرف لے جانے والی ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ (SECULAR STATE) کے الفاظ سن کر ہمارے خود فریب یا ابلہ فریب برادرانِ ملت کی پیشانیاں شکن آلود ہو جائیں گی۔ لیکن حقائق پیشانیوں کی شکنوں سے تو نہیں بدل جایا کرتے۔ یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حکومتیں سیکولر (SECULAR) ہی ہیں۔ سیکولر اسٹیٹ اسے کہتے ہیں جس میں مذہب شخصی قوانین (PERSONAL LAWS) تک محدود رہے اور باقی معاملات "دنیاوی طریق" پر طے پائیں۔ جب سے مسلمانوں کا دین، مذہب سے تبدیل ہوا ہے، مذہب کا دائرہ شخصی قوانین تک محدود ہے۔ آج مختلف اسلامی ممالک پر نگاہ ڈال کر دیکھئے۔ ہر جگہ یہی نقشہ دکھائی دیگا۔ جس طرح انگلستان میں خدا گرجے کی چار دیواری تک محدود ہے اسی طرح مسلمانوں کے ممالک میں اس کا احاطہ صحنِ مسجد سے آگے نہیں۔ لہٰذا اگر انگلستان کی مملکت سیکولر اسٹیٹ ہے تو مسلمانوں کی مملکتیں کیوں سیکولر نہیں۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر رکھا ہے اور مسلمان اعترافِ حقیقت سے آنکھیں چراتا ہے، ترکوں نے البتہ اس کی جرأت کی ہے اور اعلان کر دیا ہے کہ ان کی اسٹیٹ، سیکولر اسٹیٹ ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ اس وقت (مثلاً) مملکتِ پاکستان اور ترکی مملکت میں کیا فرق ہے جس کی وجہ سے ایک کو سیکولر اسٹیٹ کہا جائے اور دوسری کو ریلیجس اسٹیٹ؟ جب صورتِ حالات یہ ہے تو پھر بین الاقوامی معاملات کے فیصلے اسی طرح کیجئے جس طرح دنیا کی اور سلطنتیں کرتی ہیں۔ پھر "خدا" کا نام بیچ میں کیوں لایا جائے! خدا کا نام لینا صرف اسی کو زیب دیتا ہے جو اپنے تمام معاملات کے فیصلے خدا کے دیئے ہوئے قانون کے مطابق کرے۔ اسی کو خدا کا ماننے والا کہا جائے گا۔ اگر یہ صورت نہیں تو خدا کو اس کی قطعاً ضرورت نہیں کہ آپ اس کے نام کی حفاظت کیلئے متحدہ محاذ بناتے پھریں۔ برطانیہ۔ امریکی بلاک کی طرف سے یہ دعوتِ محاذ متحدہ خدا کے نام کی حفاظت کے لئے نہیں، بلکہ اپنے مفاد کی حفاظت کیلئے ابلیسی سیاست کا نقاب پوش حربہ ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ مشرقی ممالک میں بالعموم اور مسلمانوں کے عوام میں بالخصوص یہ حربہ بہت کارگر ثابت ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس میں ملا بھی انگریز پرست

اور ٹوڈی کہلا کر بدنام نہیں ہوتا بلکہ "دعوت الی اللہ" کا نقیب بن کر سامنے آتا ہے اور اس کی "دین اور دنیا" دونوں سنور جاتے ہیں۔ دنیا میں بھی حور و قصور، جنت میں بھی حور و قصور۔

فرنگ آئین رزاقی بداند	بایں بخشد از و وامی ستاند
بہ شیطاں آنچناں روزی رساند	کہ یزداں اندراں حیراں بماند

---

(۲) یومِ اقبال

اپریل آیا اور ملک میں حسب معمول اقبال ڈے کی تقاریب منائی گئیں۔ جیسا کہ طلوع اسلام ہمیشہ دہراتا رہتا ہے، اقبال کسی شخصیت کا نام نہیں جس کا سالانہ عرس منایا جانا چاہیئے۔ اقبال نام ہے ایک پیغام کا جو ہمارے نزدیک عصرِ حاضر میں قرآن کا پیغام ہے۔ اس لئے اقبال ڈے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس پیغام کو تازہ کریں اور مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ حد تک آشنا کرائیں تاکہ ہماری روشِ زندگی قرآن کے پیغام کے مطابق ڈھل جائے۔ لیکن، جیسا کہ غلامانہ ذہنیت کی حامل اقوام میں بالعموم ہوتا ہے، اقبال نہ تو شخصیت رہا اور نہ ہی پیغام، بلکہ وہ مختلف پارٹیوں کے لئے اپنی اپنی مقصد براری کا آلہ کار بن گیا۔ چونکہ عوام کو اقبال سے محبت اور عقیدت ہے اس لئے ہر پارٹی یہ چاہتی ہے کہ وہ اس راستے عوام میں مقبولیت حاصل کرلے۔ اس کا نام ہے تقریب یومِ اقبال۔ چونکہ بدقسمتی سے خود ہماری حکومت بھی ایک پارٹی بن کر رہ گئی ہے اس لئے اب اقبال ڈے حکومت کی طرف سے بھی منایا جانے لگا ہے۔ (یہ الگ بات ہے کہ مرکزی حکومت کے دفاتر میں یوم اقبال کی تعطیل بدستور بند ہے)۔ اس منافست (RACE) میں ہر پارٹی کی خواہش دوسری پارٹی کو شکست دینا ہوتی ہے اس لئے جس چیز کا نام اقبال ڈے کے اہتمامات میں تزک و احتشام اور تزئین و آرائش ہے وہ درحقیقت دنگل کی زور آزمائی ہوتی ہے۔ حساس طبائع اس کھینچا تانی کو دیکھتی ہیں اور خون کے آنسو پی کر رہ جاتی ہیں کہ وہ اقبال جو ساری عمر

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے

کا پیغام دیتا رہا، خود قوم میں پارٹی بازی کی تقویت کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم کی بدبختی کیا ہوگی؟ پھر لطف یہ ہے کہ یہ جوش و خروش اور یہ احترام و عقیدت فقط ایک دن کے لئے ہوتا ہے۔ اس کے بعد سال بھر کسی کو یاد بھی نہیں پڑتا کہ اقبال نامی کوئی شخص یہاں گذرا ہے۔ آج فرانس، اٹلی، انگلستان، جرمنی، امریکہ میں کلامِ اقبال کے ترجمے ہو رہے ہیں لیکن اس کے اپنے گھر میں (گھر سے مراد ہے وہ قوم جو اس کے پیغام کی اولیں مخاطب تھی) اس کی کس مپرسی کا یہ عالم ہے کہ ایک سالانہ عرس کے علاوہ اس کا کہیں تذکرہ تک نہیں ہوتا، بجز ریڈیو کے قوالوں کی تانوں اور طبلے کی تھاپ میں۔ حیرت ہے کہ آج سارے ملک میں دس بیس ایسے اہلِ ذوق بھی نہیں جو خالصتاً پیغامِ اقبال کی نشر و اشاعت کے لئے ایک بزمِ اقبال قائم کر سکیں؟ کیسی "حسین و سادہ و رنگین" ابتدا تھی اُس بزمِ اقبال کی جسے انٹر کالجیٹ برادرہڈ کے چند نوجوانوں نے مسجد شاہ چراغ میں ترتیب دیا تھا اور جس کے پیش نظر اقبال کی عظمت و عقیدت کے سوا کوئی ذاتی مقصد نہ تھا۔ کیا اب ہمارے کالجوں میں بھی کوئی ایسے نوجوان طالب علم نہیں، جو

اس پاکیزہ مقصد کو اپنی مساعی کا مرکز بنالیں اور اقبال کو ان ہوس کاروں کے پنجے سے چھڑا کر اپنے بے داغ سینے میں محفوظ رکھ لیں!

اقبال ان نوجوانوں سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنادو

خدا کرے قوم کے وہی نوجوان جو اقبال کی آرزوؤں کے مرکز، اس کی دعاؤں کے محور، اس کے نالۂ نیم شبی اور آہِ سحرگاہی کے مخاطب اور اس کی متاعِ عشق کے وارث تھے، پھر سے اٹھیں اور پیامِ اقبال کے لئے (کہ جو درحقیقت قرآن کا پیغام ہے) ایک سادہ اور پاکیزہ "مٹی کا حرم" بنادیں جس کی آستاں کسی ہوسناک و منصب پسند کے ناپاک و بے ذوق سجدوں سے ملوث نہ ہوسکے۔

لیکن وہ جو اقبال نے کہا تھا کہ

ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

افسردگی و پژمردگی کے اس آرزو کُش ماحول میں جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ایک ایسا مژدۂ جانفزا بھی ہے جس کی تابندگی و درخشندگی سے ساری فضا آئینہ پوش ہے۔ ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے، سفیرِ مصر متعینہ پاکستان کا تعارف، سالِ گذشتہ اِن اوراق میں کرایا جاچکا ہے۔ پچھلے سال انھوں نے، یومِ اقبال کی تقریب پر، پیامِ مشرق کا عربی منظوم ترجمہ، بحضورِ ملت پیش کیا تھا۔ اس کے بعد وہ سال بھر نہایت خاموشی سے اپنے سوزِ عشق کو دل میں لئے، ضربِ کلیم کے ترجمے میں مصروف رہے اور اس کے بعد شبانہ روز کی تگ و تاز کے بعد، حالیہ یومِ اقبال کی تقریب پر اسے اقبال کی بارگاہِ قلندری میں پیش کردیا۔ محترم عزام بے کا کتنا بڑا یہ کارنامہ اور کتنا بڑا ہے یہ احسان ملتِ اسلامیہ پر، اس کا اندازہ آنے والا مورخ ہی لگاسکے گا جو دیکھے گا کہ ان کی جگر کاوی اور عرقریزی سے ملتِ اسلامیہ کا کتنا عظیم حصہ پیامِ اقبال (یعنی بالواسطہ پیامِ قرآن) سے آشنا ہوگیا۔ چہ عجب کہ اس سے عرب ممالک میں پھر سے وہ انقلاب پیدا ہوجائے جو ایک مرتبہ اس زمین اور اس آسمان کو بدل دینے کا موجب بن چکا ہے اور جسے دوبارہ دیکھنے کے لئے سورج کی آنکھ اب تک وا ہے۔

ہم محترم عزام بے کی خدمت میں ملتِ اسلامیہ کی طرف سے دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہوئے متدعی ہیں کہ وہ اپنی اس مبارک و مسعود کوشش کو بدستور جاری رکھیں تاآنکہ پورے کا پورا اقبال عربی زبان میں منتقل ہوجائے۔ ہمیں یہ معلوم کرکے بڑی مسرت ہوئی کہ اب جناب ممدوح، اسرار و رموز کے ترجمہ کی طرف متوجہ ہیں۔ اس کوشش کا انداز بھی نہایت جاذب و حسین ہے جس کا تذکرہ خود محترم عزام بے نے ضربِ کلیم کے تعارف میں کیا ہے۔ کسقدر خوش بخت ہے وہ مختصر سا حلقۂ اربابِ قلب و نگاہ جسے پیامِ اقبال کی افہام و تفہیم کے ایسے خوشگوار مواقع میسر ہو رہے ہیں۔

لیکن بایں ہمہ بہار آفرینی و رنگیں نوائی، کسقدر تاسف انگیز ہے یہ تصور کہ ہمارے ہاں کوئی بھی انبارِ گل ایسا نہیں جس کے نیچے نشترِ خار نہ چھپا ہو۔ محترم عزام بے نے اُس والہانہ عشق و محبت کے ساتھ جس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کے اپنے سینے میں قلبِ تپاں موجزن ہو، اپنی سال بھر کی جگر سوزی کا ماحصل، یعنی ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ کا اولیں نسخہ (جسے انھوں نے خاص طور پر اشاعت سے

پہلے ہی مصر سے منگا لیا تھا) کراچی کے یومِ اقبال کے جلسۂ عام میں، اثر و جذب میں ڈوبی ہوئی تقریر کے ساتھ، اپنی گہری عقیدتمندی سے، صدر مجلسِ اقبال، کراچی، محترم سردار عبدالرب صاحب نشتر، کی خدمت میں پیش کیا۔ لیکن (اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ہماری نگاہیں فرطِ ندامت سے زمین میں گڑ جاتی ہیں کہ) انھوں نے شکریہ تو ایک طرف، اس کی رسید تک میں ایک لفظ رسماً و تکلفاً بھی زبان تک آنے نہ دیا، حالانکہ اپنی پوری تقریر میں یہ کتاب ان کے ہاتھ میں تھی اور محترم ڈاکٹر عزام بے ان کے سامنے بیٹھے تھے۔ اگر یہ سہو تھا تو یقیناً اس قابل کہ اس کی کماحقہ تلافی کی جائے۔ اور اگر (خدانخواستہ) ایسا دانستہ کیا گیا تھا (جسے باور کرنے کو قطعاً ہمارا دل نہیں مانتا) تو . . . . . (اس "تو" کے بعد کیا لکھا جائے !!) بہرحال، یہ سہو تھا یا عمد۔ ہم ملت اسلامیہ پاکستانیہ کی طرف سے، اپنی جھکی ہوئی نگاہوں اور لرزتے ہوئے ہونٹوں سے جناب محترم و ممدوح، ڈاکٹر عزام بے، سے خواستگارِ عفو ہیں اور انھیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کی اس بے لوث خدمتِ عظیم کی قدر و منزلت ہر حساس قلب کی گہرائیوں میں موجود ہے۔ ہمیں اس "قلندرِ بزمِ اقبال" کی کشادہ نگہی اور وسعتِ قلبی سے کامل توقع ہے کہ وہ ہماری اس عفو طلبی کو شرفِ پذیرائی عطا فرمائیں گے۔

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

ضربِ کلیم

[ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے، سفیرِ مصر متعینہ پاکستان، کے ترجمۂ ضربِ کلیم کا تعارف اشاعتِ رواں کے ملحقات میں مختصراً الفاظ میں کرایا جا چکا ہے۔ ذیل میں اس عربی ترجمہ کے ابتدائی صفحات کو اردو میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تین مختلف ٹکڑوں پر مشتمل ہیں۔

(۱) مقدمہ از ڈاکٹر عزام بے صاحب

(۲) تعارف از صاحبِ موصوف

(۳) پیش لفظ از محترم پرویز صاحب

ان تعارفی مقالات سے نہ صرف ضربِ کلیم کے عربی ترجمہ ہی کا تعارف ہو جاتا ہے بلکہ پیامِ اقبال کے بہت سے اہم گوشے بھی ابھر اور نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ امر طلوعِ اسلام کے لئے موجبِ صد فخر و ہزار سعادت ہے کہ اس کے دامن کو ان قیمتی جواہر کے قابل سمجھا گیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ طلوعِ اسلام]

---

(۱) مقدمہ

(ہز ایکسیلنسی ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے بالقابہ)

خدایا ہم تجھ ہی سے توفیق و ہدایت کے طلبگار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے شاعر فیلسوف ڈاکٹر محمد اقبال کے فارسی دیوان، پیامِ مشرق کا عربی ترجمہ تقریباً دس ماہ میں تیار ہو گیا۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں علامہ مرحوم کی تیرہویں برسی کے موقعہ پر یہ عربی دیوان کراچی میں چھپ کر شائع ہوا اور مجلس اقبال نے یوم اقبال کے سرکاری اجتماع میں اس کو پاکستان کے گورنر جنرل کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

عربی میں اقبال کے کلام کا یہ ترجمہ مرحوم کی دلی تمنا اور میری ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل تھی۔ آخر کار وہ منزل آگئی جس کی طرف میں نے بارہا قدم بڑھانے کی کوشش کی لیکن مصروفیتیں ہمیشہ سدِ راہ ہوتی رہی تھیں۔

"پیامِ مشرق" کے اس عربی ترجمہ "رسالۃ الشرق" نے پاکستان کے اہلِ علم، ادیب اور سیاسی طبقہ میں غیر معمولی اثرات پیدا کئے اور عربی خوان طبقہ میں اس کو خاص طور پر مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس کامیابی نے مجھے اسی راہ پر گامزن رہنے کی دعوت دی کہ اس عظیم المرتبہ شاعر کے دوسرے دیوانوں کو بھی عربی میں منتقل کروں۔ اور اس تحریک نے مجھے اس کام کو جس کی خود میں نے ہی ابتدا کی تھی، جاری رکھنے اور اس کیلئے دشواریاں برداشت کرنے پر آمادہ رکھا۔ رسالہ "الشرق" کی اس مقبولیت ہی کا نتیجہ تھا کہ بہت سے پاکستانی احباب اور متعارفین ایک دوسرے ترجمہ کی امید میں میری طرف آنکھیں لگائے ہوئے تھے۔

"پیام مشرق" کے ترجمہ کے بعد میں نے اس مقصد کیلئے "جاوید نامہ" کو تجویز کیا جس کے ترجمہ کے لئے میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ ارادہ کر چکا تھا۔ "جاوید نامہ" ایک ایسی داستان ہے جس میں اقبال نے مسلمانوں کے بہت سے احوال کا تذکرہ کیا ہے اور سیاحتِ سیارات کے پیرایہ میں اپنے فلسفہ و افکار کی تشریح کی ہے اور اس سلسلہ میں مشہور صوفی شاعر جلال الدین رومی صاحب مثنوی کو اپنا دلیل راہ بنایا ہے اس لئے میں نے کسی پس و پیش کے بغیر "پیام مشرق" کے بعد "جاوید نامہ" کو ترجمہ کے لئے منتخب کر لیا۔

لیکن اقبال کو پسند کرنے والے اور اس کے شیدائیوں میں سے ایک دوست نے جو نہ صرف اقبال کے کلام اور اس کے فلسفہ و سیرت پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان مخصوص افراد میں سے ہیں جن کو اقبال سے صحبتیں میسر رہی ہیں اور انھوں نے اقبال کے تعارف اور اس کے پیغام کی توضیح و تشریح میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا ہے، ایک دوسرے دیوان کے ترجمہ کی تجویز میرے سامنے رکھی۔

ہمارے دوست جناب غلام احمد پرویز نے فرمایا: میری رائے ہے کہ آپ "ضرب کلیم" کا ترجمہ کریں جو اقبال کا خود مرتب کردہ آخری دیوان ہے۔ اور "ارمغانِ حجاز" کے سوائے جو اقبال کی وفات کے بعد شائع ہوا ہے، اس کی آخری منظومات میں سے ہے۔ اس لئے اس دیوان "ضرب کلیم" میں اقبال کا فلسفہ اور اس کے محکم افکار و نظریات پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ اور ان خاص موضوعات میں جن کو اس نے دیوان کی فصول قرار دیا ہے، اس کا پیغام نہایت واضح ہے۔ "جاوید نامہ" ایک طویل، مسلسل اور دقیق نظم ہے جس کے سمجھنے کے لئے فلسفہ و تاریخ کے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہے اور صرف ان لوگوں کیلئے اس کے مطالب کا سمجھنا آسان ہے جن کو علم و ادب سے بہرۂ وافر میسر آیا ہو۔ "جاوید نامہ" کا مترجم ترجمہ کی تکمیل سے قبل اپنی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کے برعکس "ضرب کلیم" کا مترجم ہر قطعہ کا ترجمہ کر لینے کے بعد ایک نتیجہ خیز کام کی تکمیل کر لیتا ہے اور ایک فصل کو ختم کر کے ایک مرحلہ تک پہنچ جاتا ہے۔

ان تمام امور کے علاوہ "ضرب کلیم" میں اشعار کی تعداد کم اور ترجمہ کی سہولت نسبتاً زیادہ ہے۔ محترم دوست پیہم اسی قسم کے دلائل پیش کرتے رہے یہانتک کہ میں بھی ان کی رائے سے متفق ہو گیا کہ جاوید نامہ پر ضرب کلیم کے ترجمہ کو ترجیح دوں اور اس داستان کو ایک بار پھر کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھوں۔ اللہ مددگار رہے۔

ہماری رائے تھی کہ ترجمہ سے پہلے اس دیوان کے مطالعہ، تحقیق مطالب اور اس کی تعبیرات میں غور و فکر کے لئے ایک جگہ مجتمع ہوتے رہیں اس کے لئے طے پایا کہ اس قسم کے اجتماعات مصری سفارتخانہ کراچی کے قصر میں منعقد ہوں اور جب تک اس دیوان کے مطالعہ سے فراغت میسر آئے ہفتہ میں دو یا تین بار ہم جمع ہوتے رہیں۔

اس اندیشہ کے پیش نظر کہ مختلف مشغولیتیں ان مجالس میں سد راہ نہ ہوں ہم نے اس امر کا اہتمام کیا کہ ایک مجلس سے اسوقت تک نہ اٹھیں جبتک آئندہ نشست کیلئے کوئی وقت مقرر نہ کر لیا جائے۔ ان مجالس کا اشتیاق اور ان کی یاد ہمیں ان کی شرکت کیلئے زیادہ مستعد رکھتی تھی۔

ہیں، فاضل محترم غلام احمد پرویز اور محترم سید عبدالواحد (انسپکٹر جنرل جنگلات حکومت پاکستان) جو فلسفۂ اقبال اور اس کی سیرت پر لکھنے والے مصنفین میں سے ہیں اس مجلس کے ارکان تھے۔ ان کے علاوہ بہت سے اقبال دوست، احباب بھی ان مجالس میں شریک ہوتے۔ بعض لوگ پابندی سے آتے اور بعض ایک دو مجلسوں میں ہی شرکت کر سکتے تھے۔ اس لئے یہ حلقہ کبھی تنگ اور کبھی وسیع ہوتا رہتا تھا۔

وقتاً فوقتاً ہم دعوتوں کا اہتمام بھی کرتے تھے اور ان میں مجلس اقبال کے دوسرے ارکان اور اس کے صدر چودھری نذیر احمد کو بھی شرکت کی دعوت دیتے تھے جو اُس وقت پاکستان کے وزیر صنعت تھے۔

محترم غلام احمد پرویز شیخ مجلس تھے۔ وہ کتاب پڑھتے، اس کی تشریح کرتے اور فکرِ اقبال کی بحث و تفصیل میں کسی شعری و ادبی یا فلسفی موضوع کی انتہا تک پہنچ جاتے اور اس کے ساتھ ساتھ اقبال کے کلام کو قرآنی حقائق سے مربوط کرتے جاتے۔

ان مجالس کو "مجلس اقبال" یا "مجالس اقبال" کا نام دیا گیا تھا۔ ان میں شرکت کرنے والے "درویشانِ اقبال" اور "قلندرانِ اقبال" کے نام سے موسوم کئے جاتے۔ اور غلام احمد پرویز صاحب "شیخ درویشاں" اور "شیخ قلندرانِ اقبال" تھے۔

عید الفطر کے بعد ۱۳۷۰ھ میں ہم نے "ضرب کلیم" کا مطالعہ شروع کیا اور جب اس سے فارغ ہوئے تو میں نے کتاب کے آخری صفحہ پر بطور یادداشت حسب ذیل کلمات لکھے:

"شنبہ ۵ محرم ۱۳۷۱ھ (۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء) کی شب میں دیوان کا مطالعہ تکمیل کو پہنچا
اول و آخر خدا ہی کے لئے حمد و ستائش ہے۔ اللہ تعالیٰ روح اقبال پر رحم فرمائے۔"

تین ماہ میں کتاب ختم ہوگئی، اگرچہ اس دوران میں بعض اوقات مشاغل کی کثرت کی وجہ سے ہم مجلس کی طرف پوری توجہ نہ دے سکے اور ان کا سلسلہ ہمارے اندازے کے مطابق جاری نہ رہ سکا۔

شبِ دوشنبہ ۱۱ رشوال ۱۳۷۰ھ (۱۶ رتموز ۱۹۵۱ء) کو ضرب کلیم کے ترجمہ کی ابتدا ہوئی۔ اور جب میں اس کے ترجمہ سے فارغ ہوا تو ان سطور کے نیچے جن میں مطالعہ کی تاریخ ثبت کی گئی تھی میں نے ذیل کے کلمات تحریر کئے:

"اللہ تعالیٰ نے شب یکشنبہ ۱۸ صفر الخیر ۱۳۷۱ھ (۱۸ تشرین ۲ ۱۹۵۱ء) کو ترجمہ کی تکمیل کی توفیق ارزانی فرمائی۔"

اس طرح تقریباً چار ماہ تک میں ترجمہ کے کام میں مشغول رہا اور مطالعہ کتاب کے ڈیڑھ ماہ بعد اس سے فراغت میسر آگئی۔

"پیام مشرق" کے ترجمہ میں طباعت کی صفائی اور دیدہ زیبی کے لحاظ سے جو فرو گذاشتیں رہ گئی تھیں ان کی مکافات کی غرض سے اس دیوان کی طباعت کیلئے میں نے مصر کو ترجیح دی۔ چنانچہ سفر وطن کی تیاری شروع کی اور جب ۲ ردسمبر کو وطن مالوف پہنچا تو سفر پیہم اور کثرت مشاغل کے دوران میں فرصت کے جو لمحات میسر آئے ان میں دیوان کی تبییض اور اس کو طباعت کیلئے تیار کرنے کا شغل جاری رکھا۔ فاضل عزیز محمود جعفر الجبالی (ٹیکس انسپکٹر حکومت مصر) نے ان مبیضات کو ٹائپ کرنے کی ذمہ داری لی۔

لجنۃ الازہر نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس دیوان کو وہ اپنے اہتمام سے شائع کریں تاکہ یہ انہی کی مطبوعات میں شمار کیا جائے۔

میں نے شکرگذاری کے ساتھ ان کی یہ پیش کش قبول کرلی۔ میری خواہش تھی کہ اس کی طباعت میرے قیام وطن کے دوران میں مکمل ہوجائے تاکہ میں خود اس کی تصحیح کی نگرانی کرسکوں اور ضرورت ہو تو بعض کلمات میں ترمیم وتبدیل کا فرض بھی انجام دوں۔ لیکن یہ ممکن نہ ہوسکا اور کتاب کی طباعت سے قبل ہی مجھے پاکستان آنا پڑا۔

عزیز محترم جناب جمالی طباعت کی نگرانی اور پابندی کے ساتھ میرے پاس ہوائی ڈاک سے پروف بھیجتے رہنے کی ذمہ داری انجام دیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

واقعی یہ ایک خوش نصیبی ہے کہ اس عظیم فلسفی شاعر۔ اقبال۔ کی تمنا میرے ذریعہ برآرہی ہے اور اقبال کے بعض دواوین میرے توسط سے عربی میں منتقل ہوکر قرآنی زبان کی ادبی دولت میں اضافہ کررہے ہیں۔

یہ امر بھی میرے لئے باعث مسرت ہے کہ اسلام کے اس ممتاز شاعر کی چودھویں سالانہ یادگار کے موقعہ پر میں ضرب کلیم کو عربی لباس میں پیش کررہا ہوں جیسا کہ اس سے قبل تیرھویں برسی کے موقعہ پر میں نے "پیام مشرق" کے ترجمہ کی پیش کش کی تھی۔

بارہا میں نے یہ آرزو کی تھی کہ اقبال کے دواوین کا عربی میں ترجمہ کروں لیکن مجھے کبھی یہ امید نہیں تھی کہ توفیق الٰہی سے آٹھ ماہ سے کم مدت میں دو دیوانوں کے ترجمہ کی خدمت انجام دینا میرے لئے ممکن ہوسکے گا اور ایک ہی سال میں ان کی اشاعت کا مرحلہ طے ہوجائے گا۔

اس توفیق عظیم کے لئے اللہ ہی کا شکر وسپاس ہے اور اسی سے توفیق والہام اور راستکاری کی التجا کی جاسکتی ہے۔ وھوحسبی ونعم الوکیل۔

عبدالوہاب عزام ۔ کراچی

۱۹ جمادی الثانی ۱۳۷۱ھ ۔ ۱۰ اپریل ۱۹۵۲ء

---

(۲) تعارف

(ڈاکٹر عزام بے موصوف)

ضرب کلیم اقبال کا ایسا مجموعۂ کلام ہے جو انسان بحیثیت فرد، انسان بحیثیت رکن جماعت، دین، تربیت، ادب اور سیاست کے متعلق حکیمانہ افکار ونظریات پر مشتمل ہے۔ اس اعتبار سے یہ کلام شعریت کی نسبت فلسفہ اور تفکر میں زیادہ ڈوبا ہوا ہے لیکن جذبات اور تخیل کی آمیزش نے اس کو شعر کی صف میں شامل کردیا ہے۔ کائنات کی ہر وہ حقیقت شعر بن جاتی ہے جو انسان کے جذب و وجدان سے آب ورنگ حاصل کرلیتی ہے یا جس کو انسانی تخیل ایک خاص شکل وصورت میں نمایاں کردیتا ہے۔

شعریت ایک دائرہ ہے اور موضوعاتِ شعر اس دائرہ کے خط محیط سے مرکز تک مرتب اور منظم ہیں۔ بعض موضوعات خط محیط سے قریب تر ہیں۔ ان کو شعر سے کم اور ان موضوعات سے زیادہ قریبی ربط ہوتا ہے جو اس دائرے سے خارج ہوں۔ بعض موضوعات شعریت میں زیادہ عمیق ہوتے ہیں اور اس طرح جذبہ وتخیل کے تناسب کے ساتھ یہ ترتیب مرکزی دائرہ کی خالص شعریت تک پہنچ جاتی ہے۔

ضرب کلیم میں بعض اوقات اقبال کا کلام شعر کی اس صنف میں جلوہ آرا ہوتا ہے جو مجرد حقائق سے قریب تر ہے اور بعض مرتبہ

خالص شعریت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ مرکز شعر کی بہ نسبت خطِ محیط سے زیادہ قریب ہے۔

اس بنا پر پیام مشرق کی بہ نسبت مجھے ضرب کلیم کے ترجمے میں زیادہ مشقت اور دشواری کا سامنا ہوا ہے۔ اس دشواری کی ایک خاص وجہ میری یہ زبردست خواہش بھی تھی کہ ترجمے میں شعری نزاکتیں پوری طرح محفوظ رہیں۔ اصل کا حسنِ شعر پھیکا نہ ہو جائے اور وہ ہلکی سی رنگین شعری نقاب نہ اتر جائے جو اقبال نے حقائق فلسفیہ کے چہرے پر ڈالی ہے۔ کہیں ایک چمن سے دوسرے چمن میں منتقل کرنے کی وجہ سے شعر کی یہ ننھی ننھی کلیاں مرجھا نہ جائیں۔

بحیثیت مجموعی یہ کلام نغمہ موسیقی نہیں بلکہ ایک ایسی ضرب خارا شگاف ہے جو سینۂ سنگ سے چشمے پیدا کرتی ہے جیسا کہ خود اقبال نے کہا ہے:

یہ زوردست و ضربت کاری کا ہے مقام میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

شاید پڑھنے والے اس کلام میں شاعرانہ انداز، تخیل اور تازگی فکر کی جستجو کی بجائے ان حقیقتوں کو زیادہ شفاف محسوس کریں گے جن کو پیرایۂ شعر میں ظاہر کیا گیا ہے اور شاید اس طرح وہ انشاء پرداز اور مترجم کی ان دشواریوں کا بھی اندازہ لگا سکیں گے جو ایک سنجیدہ اور متین اسلوب شعر میں ان حقائق کی نقاب کشائی میں پیش آئی ہیں۔

ابواب و فصول

شاعرِ مشرق نے ضربِ کلیم کو چھ فصلوں پر تقسیم کیا ہے اور ان سے پہلے دو قطعے اور ایک قصیدہ پیش کیا ہے۔ پہلا قصیدہ ان چند ابیات پر مشتمل ہے جن میں دیوان کو نواب حمید اللہ خاں والی بھوپال کے نام معنون کیا گیا ہے۔ دوسرے قطعے میں شاعر نے قارئین سے خطاب کیا ہے اور قصیدہ کو دیوان کی تمہید کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دیوان کی فصول حسب ذیل ہیں:

(۱) اسلام اور مسلمان۔ (یہ اس دیوان کی سب سے طویل فصل ہے)

(۲) تعلیم و تربیت۔

(۳) عورت۔

(۴) فنون لطیفہ۔ (یہ دیوان کی دوسری طویل فصل ہے۔)

(۵) سیاست مشرق و مغرب۔

(۶) محراب گل افغان کے افکار۔

فلسفۂ اقبال

اس موقع پر اقبال کے فلسفے کے متعلق بھی چند مختصر کلمات پیش کرنا مناسب ہے جو اقبال کے مقاصد عالیہ اور اس کا منتہائے نظر سمجھنے میں پڑھنے والوں کیلئے مددگار ثابت ہوں گے۔ اقبال کے فلسفہ کی اساس وہ تصور ہے جس کو اس نے خودی سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال نے بہت سے اشعار میں اپنے اس مسلک کو واضح کیا ہے اور اس کے لئے ایک جداگانہ مثنوی بھی مخصوص کی ہے

جس کا نام اسرارِ خودی ہے۔

فلسفۂ خودی کا ماحصل یہ ہے کہ

(ا) خودی جوہرِ کائنات ہے، نظامِ کائنات کی بنیاد اور اس کا سرِ حیات ہے۔

(ب) حیاتِ خودی مقاصد اور امنگوں کی تخلیق پر مبنی ہے۔

(ج) عشق آرزو، سعیٔ پیہم، بیباک عمل اور خطر پسندی سے خودی کو فروغ میسر آتا ہے۔

(د) جہادِ مفصل اور جہدِ پیہم سے زندگی قوت و نمو اور فروغ پاتی ہے اور جھجک، تردد، آسائش طلبی اور پستیوں پر قناعت سے شعلۂ حیات افسردہ ہو جاتا ہے۔

انسان کے لئے یہ ضروری ہے کہ خود اعتماد ہو، فطری صلاحیتوں کو بروئے کار لائے اور اپنے قول و فعل میں خودی کو نمایاں کرے۔ تقلید، غیر پر اعتماد اور دوسروں کے سامنے دست طلب بڑھانے سے اجتناب کرے اور ان قوتوں سے غافل نہ ہو جو اس کی ذات میں ودیعت کی گئی ہیں۔

ان چیزوں سے خودی محکم ہوتی ہے اور خودی کا استحکام ہی اس زندگی کا مقصد ہے۔ شاعرِ مشرق اشیاء کی حسی اور معنوی قوتوں کا دلدادہ ہے اور اسی لئے وہ جرمن فلسفی نیٹشے کو پسند کرتا ہے لیکن اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ نیٹشے صرف جسم کا ادراک کر سکا اور عرفانِ روح سے بے بہرہ رہا اس کی دسترس محض علم و عقل تک ہے قلب و عشق تک اس کو رسائی حاصل نہ ہو سکی اور اس لئے اقبال کہتا ہے کہ وہ نکتۂ توحید کا اہل نہ تھا۔

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم نگاہ چاہئے اسرارِ لا الٰہ کے لئے

اقبال کے نزدیک قوت و قدرت عناصرِ جمال ہیں۔ جلال کے بغیر کمالِ جمال ناممکن ہے۔ جلال اور جمال کے عنوان سے ایک قطعہ میں وہ کہتا ہے:

میری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک
نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک

بلکہ وہ کہتا ہے کہ افسردہ و مضمحل شعلے عذاب کے لئے بھی موزوں نہیں ہیں۔

مجھے سزا کے لئے بھی نہیں قبول وہ آگ کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

اقبال کے نزدیک حسن و قبح اور خیر و شر خودی کی پستی و بلندی کے تابع ہیں۔

نمود جس کی فراز خودی سے ہو وہ جمیل جو ہو نشیب میں پیدا وہ قبیح و نامحبوب

پختہ اور محکم خودی کی انفرادیت جماعت میں منسلک ہونے کے باوجود فنا نہیں ہوتی۔ "رموزِ بے خودی" میں اقبال نے واضح کیا ہے کہ ایک فردِ قوی کس طرح جماعت سے وابستہ رہ کر استفادہ کرتا ہے اور اس وابستگی کے باوجود اس کا انفرادی تشخص کس طرح برقرار

رہتا ہے۔ ضربِ کلیم میں وہ مردِ بزرگ کے عنوان سے ایک قطعے میں کہتا ہے:

شمع محفل کی طرح سب سے جداسب کا رفیق

انسان کائنات کی عظیم ترین حقیقت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے۔ قرآن میں کہا گیا ہے:۔

ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبات وفضلناھم علیٰ کثیر ممن خلقنا تفضیلاہ

وسخر لکم ما فی الارض جمیعاہ

وسخر لکم الانھار وسخر لکم الشمس والقمر دائبین وسخر لکم اللیل والنھار واتاکم من کل ماسالتموہ وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا

انسان مجبور و بے اختیار نہیں بلکہ آزاد و خود مختار ہے۔ اس کا عزم نشانِ تقدیر ہے یا آثارِ قضا پر جاری ہے۔ ایک مومن آزاد اس دنیا میں بلکہ دنیا و آخرت میں صلاح و فساد اور بقا و فنا کا معیار ہے۔

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

نباتات و جمادات قانون طبیعت کے محکوم ہیں لیکن مردِ مومن اپنے پروردگار کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا کسی چیز کا پابند نہیں ہے۔

تقدیر کے پابند نباتات و جمادات مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند

تہذیب جدید

اقبال کہتا ہے یورپین تہذیب محض مادی ہے جس میں نہ قلب ہے نہ روح۔ اقبال نے اس تہذیب پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ وہ اس مادی تہذیب کے فلاسفہ کا تذکرہ کرتا ہے لیکن ان کے بیشتر نظریات کو رد کر دیتا ہے وہ صرف اسلام اور اس کی تہذیب میں بشریت کی فلاح دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامی تہذیب ہی نوعِ انسانی کے باہمی ربط و ائتلاف کا ذریعہ بن سکتی ہے اور اس کو برادرانہ انس و تعاون کے ساتھ شاہراہِ حق پر مجتمع کر سکتی ہے۔

اقبال کا فلسفہ ضربِ کلیم میں

خودی اور عناصرِ خودی کے متعلق اقبال کا فلسفہ۔ اسلامی اور یورپی تہذیب کے متعلق اس کے نظریات اور ان کے علاوہ اس کے دوسرے حکیمانہ افکار و آراء، یہاں تک کہ ادب اور فنونِ لطیفہ کے متعلق اس کے زاویۂ نگاہ ضربِ کلیم کی تقریباً ہر فصل میں جھلکتے ہیں۔

اقبال کے نزدیک وہ موسیقی حرام ہے جس سے روح میں ضعف و اضمحلال پیدا ہوتا ہو۔

اگر نوا میں ہے پوشیدہ موت کا پیغام حرام میری نگاہوں میں نائے چنگ و رباب

مصور کے لئے ضروری ہے کہ زندگی کی عکاسی کرے، اور فطرت کی محاکات کرتے ہوئے آثارِ طبیعت میں اپنا نقشِ خودی نمایاں کرے۔

فطرت کو دکھایا بھی ہے دیکھا بھی ہے تو نے آئینۂ فطرت میں دکھا اپنی خودی بھی

فقر ضرب کلیم اور دوسرے دیوانوں میں بہت سے مواقع پر اقبال نے فقر پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے۔ وہ فقر کو کلید خیر و سعادت اور سربلندی کا وسیلہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک فقر خطرات میں بیباکانہ کود پڑنے کا محرک ہے۔

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے وہ فقر جس میں ہے بے پردہ روح قرآنی

اس کا دعوٰے ہے:

خوار جہان میں کبھی ہو نہیں سکتی وہ قوم عشق ہو جس کا جسور فقر ہو جس کا غیور

وہ کہتا ہے:

فقر جنگاہ میں بے ساز و یراق آتا ہے ضرب کاری ہے اگر سینے میں ہے قلب سلیم
اس کی بڑھتی ہوئی بیباکی و بیتابی سے تازہ ہر عہد میں ہے قصۂ فرعون و کلیم

اور اس لئے اس کی تمنا ہے کہ

اللہ کرے تجھکو عطا فقر کی تلوار

اقبال کے کلام میں غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک فقر بے زری یا مال کی کمی کا نام نہیں ہے۔ نہ وہ احتیاج معاش اور اس متاع دنیوی کی حاجتمندی کا نام ہے جس کو انسان اپنے لئے باعث عزت سمجھتا ہے بلکہ فقر سے اس کی مراد یہ ہے کہ نفس ہوس ملک اور حرص و طمع کی قیود سے آزاد رہ کر عمل کی طرف اس طرح پیشقدمی کرتا رہے کہ کوئی کامیابی اس میں سرکشی اور کوئی محرومی اس میں پستی پیدا نہ کر سکے۔ بسا اوقات فقیر سیم و زر کے انبار کا بھی مالک ہو سکتا ہے اور بہت مرتبہ صاحب سطوت بادشاہ بھی۔ لیکن مال و متاع کسی وقت بھی اس کی سطوت و جبروت کو درماندہ نہیں کر سکتے۔

فقر کا یہ مفہوم بعض صوفیا کی تشریح سے مختلف نہیں ہے۔

قشیری نے اپنے رسالے میں یحیٰی ابن معاذ کا قول نقل کیا ہے کہ

فقر کی حقیقت یہ ہے کہ خدا کے سوا ہر چیز سے بے نیازی ہو۔

شبلیؒ کا بیان ہے کہ

فقر کی ادنیٰ ترین علامت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص تمام دنیا کا مالک ہو کر اس کو ایک ہی دن میں خرچ کر ڈالے اور پھر اس کے قلب میں یہ خطرہ گذر جائے کہ اس میں سے صرف ایک دن کی روزی روک لیتا تو اس کا فقر صادق نہیں ہے۔

رسالہ قشیریہ میں ایک دوسرے موقع پر کہا گیا ہے۔

صحت فقر کا معیار یہ ہے کہ اس ذات کے سوا جس کی طرف فقیر کی احتیاج ہے کسی چیز کے حصول سے استغنا میسر نہ آئے۔

سہروردی نے عوارف المعارف میں کتانی کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

جب فقر الی اللہ درست ہو جاتا ہے تو غنا غنی باللہ میسر آتا ہے یہ دونوں احوال ہیں اور ایک کی دوسرے کے بغیر تکمیل نہیں ہوتی۔

ان بیانات سے واضح ہے کہ فقر ملک و مال کے فقدان کا نام نہیں ہے اس کی حقیقت صرف یہ ہے کہ انسان ان چیزوں سے وابستہ نہ ہو جن کو وہ پالیتا ہے یا کھو دیتا ہے یعنی یہ کہ دنیا اس کے دل میں بسی ہوئی نہ ہو خواہ اس کے ہاتھوں میں کھیلتی ہو۔

اقبال کہتا ہے:

ہمت ہو اگر توڈھونڈھ وہ فقر — جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا — اللہ کی شانِ بے نیازی
یہ فقر غیور جس نے پایا — بے تیغ و سناں ہے مردِ غازی
مومن کی اسی میں ہے امیری — اللہ سے مانگ یہ فقیری

---

(۳) پیش لفظ

(محترم پرویز صاحب)

جس کتاب کا ترجمہ آپ کے پیش نظر ہے، علامہ اقبال نے اس کا نام ضربِ کلیم رکھا اور خود ہی اس کی تشریح ان الفاظ سے کر دی۔

اعلانِ جنگ عصرِ حاضر کے خلاف

میرے نزدیک یہ الفاظ علامہ اقبال کی صرف ایک کتاب، ضربِ کلیم ہی کے شارح نہیں بلکہ ان کے پورے کے پورے پیغام کے ایک عظیم حصے کے مفسر ہیں۔ اگر حضرت علامہ کے پورے پیغام کا تجزیہ کیا جائے تو وہ دو اہم حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حصہ نفیرِ انقلاب ہے اس "غیر منزل من اللہ" اسلام کے خلاف، جسے عجمی سازش نے نہایت سادگی اور پرکاری سے وضع کیا اور دامِ ہمرنگ زمین کی صورت میں، عینِ اسلام بنا کر اُس امت پر مسلط کر دیا جو ان غیر قرآنی تصورات کو مٹانے کیلئے مبعوث ہوئی تھی۔ عجم کی یہ سازش درحقیقت انتقام تھی یہود و نصاریٰ و مجوس کی ان شکستوں کا جو انھیں میدانِ جنگ میں مسلمانوں کی تیغِ حق کے مقابلے میں اٹھانی پڑیں۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ اس ملتِ مجاہدین کی قوت و سطوت کا راز قرآن کی حیات بخش تعلیم میں ہے۔ لہٰذا انھوں نے ایسی چال چلی کہ مسلمانوں کو قرآن سے یکسر بیگانہ بنا کر، غیر قرآنی اسلام کے فریب میں الجھا دیا۔ اور یہ کچھ اس کامیاب طریق سے کیا کہ سادہ لوح مسلم اس سراب رنگ و بو کو سچ مچ کا گلستاں سمجھنے لگ گیا۔ یونان کا خواب آور فلسفۂ حشیشین۔ مجوس کی غلامانہ نسل پرستی۔ یہود کی قشری شریعت رسومات۔ رہبانِ نصاریٰ کی مرگ آفریں خانقاہیت، ایک ایک کر کے اسلام کے لاینفک اجزا بن گئے، اور اس طرح یہ ملت جو کبھی ذوقِ عمل سے شعلۂ جوالہ تھی، کوتاہیٔ اہل سے راکھ کا ڈھیر بن گئی۔ اقبال کے پیغام کا ایک حصہ اسی "غیر منزل من اللہ"

اسلام کے لئے پیامِ مرگ اور قرآنی اسلام کے احیاء کے لئے نشیدِ حیات تھا۔

علامہ کے پیغام کا دوسرا حصہ اس فتنے کے خلاف احتجاجِ مسلسل تھا جو تہذیبِ مغرب کے رنگ میں، طوفان در طوفان امنڈے چلا آرہا تھا اور جس کی تموج انگیز طغیانیاں ملتِ اسلامیہ کی نژادِ نو کو خس و خاشاک کی طرح بہائے لئے جارہی تھیں۔ ضربِ کلیم اس تہذیبِ عصرِ حاضر کے جنود و عساکر کے خلاف اعلانِ جنگ تھا۔

سوال یہ ہے کہ تہذیبِ حاضر کہتے کسے ہیں اور اقبال نے اس کی اسقدر مخالفت کیوں کی؟ اس سوال کا جواب سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک پہلے یہ نہ دیکھ لیا جائے کہ اسلامی تہذیب کیا ہے۔

جس شخص کے سامنے قرآن کے اوراق کھلے ہیں اس پر یہ حقیقت روشن ہے کہ اسلام ایک ضابطۂ حیات اور نظامِ زندگی ہے جسے الدین کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن نے انسانی زندگی کے لئے ایک نصب العین مقرر کر دیا ہے اور اس کے ساتھ وہ حدود متعین کر دی ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے انسان اپنے اختیارات کا استعمال کر سکتا ہے۔ یہ نصب العین اور حدود دونوں غیر متبدل ہیں انہی کو ابدی صداقتیں یا مستقل اقدارِ زندگی کہا جاتا ہے۔

قرآن کی رو سے اگرچہ حیات کی نمود مختلف پیکروں میں ہوتی ہے، حیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ اور یہی سرچشمہ ان ابدی صداقتوں کی اصل ہے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ سرچشمۂ حیات اور ابدی صداقتوں کے سرچشمہ کی وحدت کے عقیدے سے فطری طور پر یہ نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ

(ا) ہر انسان من حیث الانسان زندگی کی ممکنات اپنی ذات میں مضمر رکھتا ہے جن کی نشوونما اور نمودِ زندگی کا مقصود ہے۔ ان جواہرِ مضمر کی پختگی اور تابندگی سے انسان میں شانِ انفرادیت پیدا ہو جاتی ہے جس کا تحفظ، بقا اور تسلسل (بعد از ممات) انسانی جدوجہد کا ماحصل ہے۔

(ب) تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں جو جغرافیائی، لسانی، نسلی، اور وطنی حدود سے متاثر نہیں ہوتی۔

(ج) تمام نوعِ انسانی کی فلاح کا راز ایک ہی ضابطۂ زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنے میں ہے جو وحی کے ذریعے ملسکتا ہے اور جو آج، اس آسمان کے نیچے، قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔

ان محکم اصولوں کی بنیاد پر اسلام ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جس میں نوعِ انسانی زندگی کی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی شرفِ انسانیت کے سدرۃ المنتہیٰ تک جا پہنچے۔ اس معاشرے کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔

(۱) اس میں افرادِ معاشرہ اپنے اندر ان صفاتِ خداوندی کو منعکس کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں جنھیں قرآن اسماء الحسنیٰ سے تعبیر کرتا ہے اور جو کائنات میں مستقل اقدار کا سرچشمہ ہیں۔

(۲) ان افراد میں ایسا ضبط پیدا ہو جاتا ہے جس سے وہ ان صفات میں ٹھیک ٹھیک توازن قائم رکھ سکتے ہیں۔ اسلئے کہ اسماء کیلئے حسنیٰ کی شرط ضروری ہے اور حسن نام ہے تناسب کے اعتدال کا۔

(۳) ان افراد کی نگاہوں میں ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے وہ صحیح صحیح فیصلہ کر سکتے ہیں کہ فلاں خارجی حادثہ کی صورت میں فلاں قسم کی صفتِ خداوندی کا ظہور ہونا چاہئے۔

(۴) ان افراد پر مشتمل جماعت میں اشیائے فطرت کی تسخیر کی قوت اور ان کے ماحصل کو فلاحِ انسانیت کے لئے صرف کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

(۵) وحدتِ خالق، وحدتِ انسانیت اور وحدت و ائتلافِ ملت کے محکم تصور سے انسان اور کائنات۔ انسان اور انسان۔ اور خود انسان کے اپنی ذات کے تضادات میں توافق پیدا ہو جاتا ہے جس سے انسانی معاشرہ کی ناہمواریاں مٹتی چلی جاتی ہیں۔

(۶) اس جماعت کا ہر فرد اپنے آپ کو خدا کی صفتِ رب العالمین کا مظہر سمجھتے ہوئے بلا مزد و معاوضہ، انسانیت کی ربوبیت کا کفیل بن جاتا ہے۔ اس طرح تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بھی از خود پوری ہوتی جاتی ہیں اور ان کی فطری صلاحیتوں کے کامل نشوونما کے وسائل و اسباب یکساں طور پر میسر ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح زندگی کی جوئے رواں، ہنستی، کھیلتی، رقص کرتی، شاداں و فرحاں، اقطار السموات والارض سے آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ ہے مختصر سے الفاظ میں قرآنی تہذیب کا ماحصل۔ اس کے برعکس تہذیبِ عصرِ حاضر اس تصور کی یکسر نقیض ہے۔ اس تہذیب کی اساس یہ فلسفہ ہے کہ مادی عناصر کے محض اتفاقیہ طور پر یکجا ہو جانے سے حیات وجود میں آ گئی اور ان عناصر کے منتشر ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ دنیا یہی مادی عناصر کی دنیا ہے جس میں ہر شے تغیر پذیر ہے۔ لہٰذا دنیا میں نہ کوئی مستقل اقدار ہیں نہ قانونِ مکافاتِ عمل۔ خیر وہ ہے جس سے کسی فرد یا افراد کے گروہ، قوم کو ذاتی فائدہ حاصل ہو جائے (خواہ اس سے دوسرے افراد یا دوسری اقوام کی رگِ حیات ہی کیوں نہ کٹ جائے) اور شر وہ ہے جس سے کسی فرد یا قوم کا ذاتی نقصان ہو۔ ہر فرد یا قوم کا نصب العین حیات منفعتِ خویش کا حصول ہے اور علم و عقل کا کام یہ ہے کہ وہ اس منفعت کے حصول کے لئے اسباب و تدابیر اور حیل و مکائد فراہم کرے۔ اس فلسفۂ حیات (یا تہذیبِ عصرِ حاضر) کا نتیجہ یہ ہے کہ انفرادی طور پر خود اہلِ مغرب کی تحقیق کے مطابق، وہاں کی آبادی کا ہر چھٹا فرد ایسا ہے جسے عمر کا کچھ نہ کچھ حصہ پاگل خانے میں گذارنا ہوگا۔ اور اجتماعی طور پر یہ عالم ہے کہ دنیا کی مختلف قومیں یا تو باہمی کشت و خون کے لئے مصروف پیکار رہتی ہیں یا اس کشت و خون کی تیاری میں مشغول۔

اقبال نے اقوامِ مغرب کے فلسفۂ حیات اور نظریۂ سیاست و عمرانیت کا گہری نظروں سے مطالعہ کیا۔ جس سے اس پر یہ حقیقت منکشف ہو گئی کہ یہ فلسفۂ حیات اور منہاجِ زندگی دنیا میں جہنم پیدا کر دینے کا موجب ہے۔ دوسری طرف قرآنی بصیرت نے اس پر حقائقِ زندگی کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ وہ بادلوں میں چھپی ہوئی بجلیوں اور ہواؤں میں مستور طوفانوں کو بے حجاب اپنے سامنے دیکھ لیتا تھا۔ یہی تھی وہ قرآنی بصیرت جس کی بنا پر اس نے ۱۹۰۷ء میں، اقوامِ مغرب کو للکار کر کہہ دیا تھا کہ

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

اس وقت سے لیکر اپنی زندگی کے آخری لمحات تک، اقبال اقوامِ مغرب کو بالعموم اور ملت اسلامیہ کو بالخصوص اس اہرمنی تہذیب کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتا رہا۔ اس مجموعۂ انذار و تنذیر کا نام ہے، ضربِ کلیم، جس سے اقبال بتکدۂ عصرِ حاضر کے تمام بتوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیتا ہے۔ لیکن وہ اپنے عصائے کلیمی سے صرف فرعونیت، ہامانیت اور قارونیت ہی کے نگاہ فریب سحر کو نہیں توڑتا بلکہ وہ اس کے بعد اپنی قوم کو قندیلِ قرآنی کی روشنی میں، فاران و سینا کی ان محفوظ و بابرکت وادیوں میں لے جاتا ہے جہاں زمین سے فوز و فلاح کے چشمے ابلتے اور آسمان سے رشد و سعادت کے من و سلویٰ اترتے ہیں۔

پیامِ اقبال کی خوش بختی ہے کہ وہ، رفیقِ محترم صاحب السعادۃ، عبدالوہاب عزام بے کی "خارہ شگافی اور جوئے شیر آوری" کے تصدق، تنگنائے اردو سے نکل کر بحیرۂ عرب میں بادباں کشا ہوتا ہے، اور اس طرح اپنی اس افادیت کو جو اس وقت تک "شرمندۂ ساحل" تھی، بیکراں بنا رہا ہے۔

اور خوش بختی ہے خود عربی بولنے والی ملتِ اسلامیہ کی جو اس پیامِ حیات بخش سے، جو معنوی لحاظ سے ان سے اسقدر قریب ہونے کے باوجود لفظی اعتبار سے ان سے اتنا دور تھا، شرفِ تعارف حاصل کر رہی ہے۔

محترم پرویز صاحب کے تعارف کا یہ حصّہ اوّل ہے۔ حصہ دوم عدم گنجائش کے باعث روک لیا گیا ہے۔ انشاء اللہ ان دونوں حصّوں کو آئندہ اشاعت میں یکجا شائع کر دیا جائے گا۔

مدیر

پیغامِ اقبال اور ہم

(یہ نظم ۲۱ اپریل ۱۹۵۲ء کو یومِ اقبال کے جلسہ جہانگیر پارک کراچی میں پڑھی گئی)

اک جہاں بہرہ ور اقبال کے الہام سے ہے
ہم مگر وہ ہیں جنھیں عشق فقط نام سے ہے

ذوق

روشناس اس نے کیا رومی و رازی سے ہمیں
دوستی اپنی ابھی حافظ و خیام سے ہے

تمدن

کہا تعمیرِ خودی پر ہے تمدن کی بِنا
ہم نے جانا کہ یہ تعمیرِ در و بام سے ہے

پردہ

عورتوں کے لئے کی اُس نے جو تلقینِ حجاب
ہم سمجھتے رہے شاعر کے یہ اوہام سے ہے

مجلسِ اقوام

انجمن جس کو وہ کہتا تھا کفن دُزدوں کی
رابطہ اپنا اُسی مجلسِ اقوام سے ہے

فتنہ

جس کے فتنے سے ہمیں اس نے خبردار کیا
ہم کو امید اسی فِطنتِ ناکام سے ہے

حرم

اُس نے تعمیرِ حرم پر ہمیں مائل تو کیا
پھر بھی الفت ہمیں افرنگ کے اصنام سے ہے

جمہوریت

اُس نے بچنے کو کہا ہیئتِ جمہوری سے
اور ہمیں اُنس اسی کے قفسِ دام سے ہے

وطنیت

تھا جہاد اس کا ہمیشہ وطنیت کے خلاف
اپنے نزدیک مقدم وطن اسلام سے ہے

وحدتِ ملت

ہم کو لاکھ اُس نے دیا وحدتِ ملت کا سبق
پھر بھی تنظیم ہماری ابھی اقوام سے ہے

قرآن

کہا قرآن سے ملتی ہے مسلمان کو حیات
اور ہمیں کد ہے تو قرآن کے احکام سے ہے

اسلام

اُس کو تو فکر چمن بندیٔ اسلام کی تھی
ہم کو اندیشہ چمن بندیٔ اسلام سے ہے

اس نے جو کچھ بھی کہا ہم نے کیا اُس کے خلاف
کس قدر ضد ہمیں اقبال کے پیغام سے ہے

(اختر ملتانی)

اسلامی نظام

پرویز

[جناب پرویز کا یہ محققانہ مقالہ طلوع اسلام بابت ماہ جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ "اسلامی نظام کیا ہے اور اسے کس طرح رائج کیا جا سکتا ہے"۔ یہ عنوان ویسے بھی کچھ کم اہم نہیں لیکن تشکیل پاکستان کے بعد اس کی اہمیت نے ایک عملی شکل اختیار کر لی ہے اور گذشتہ چار سال سے اس کے متعلق مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ موضوع کی اہمیت کے اعتبار سے اس مقالہ کی مانگ برابر جاری رہی ہے۔ اب اسے احباب کے مسلسل تقاضوں کے پیش نظر، صاحب مقالہ کی نظر ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ آپ اس مضمون کا مطالعہ گہری توجہ سے فرمائیے اس لئے کہ جو خیال، مروجہ معتقدات سے ذرا ہٹ کر پیش کیا جائے وہ شروع شروع میں انوکھا دکھائی دیا کرتا ہے کیونکہ طبائع اس سے غیر مانوس ہوتی ہیں۔ اگر آپ اسے گہری نظر سے دیکھیں گے تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس میں وہی کچھ بتایا گیا ہے جو قرآن چاہتا ہے۔۔

اس مقالہ کی اشاعت کے بعد محترم پرویز صاحب نے دو ایک مقامات پر اس کے بعض اجمالات کی تفصیل پیش کی تھی ہم ان اضافوں کو بھی اس مقالہ کے ساتھ ہی شائع کرتے ہیں تاکہ پورے کا پورا موضوع بیک وقت سامنے آجائے۔ طلوع اسلام]

غالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے کہ "شخصیت پرستی" کے عنوان سے میرا ایک مبسوط مضمون شائع ہوا۔ اس میں میں نے بتایا تھا کہ اسلامی نظام زندگی میں قرآن، احادیث اور فقہ کی صحیح حیثیت کیا ہے اور انھیں کس مقام پر رکھنا چاہیئے۔ چونکہ مسلمانوں کا اکثر و بیشتر مسلک یا رواہ پرستی ہے ... یا ائمہ پرستی۔۔ اور میرے مضمون میں خالص "خدا پرستی"[1] کی طرف دعوت دی گئی تھی اس لئے ان کی طرف سے اس دعوت کی مخالفت لازمی تھی۔ اس لئے بھی کہ عجمی تصورات، جو اس شخصیت پرستی کے ذمہ دار ہیں، مسلمانوں کے دل و دماغ پر صدیوں سے مسلط ہو رہے ہیں اور ان کے اثرات ان کے خون کے ذرات تک میں سرایت کر چکے ہیں۔ ان کا ازالہ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ معتقدات خواہ کتنے ہی غلط کیوں نہ ہوں، انسان کی عزیز ترین متاع ہوتے ہیں اور وہ اس متاعِ گراں قدر کے چھننے میں سخت صدمہ محسوس کرتا ہے۔ بنابریں اس دعوت کی مخالفت اور بھی شدید ہوئی۔ حتیٰ کہ میرے بعض قریبی دوستوں تک نے اس سے متاثر ہو کر مجھ سے کہا کہ تم نے اس نظری بحث کو کیوں چھیڑ دیا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ بحث نظری نہیں ہے۔ نظری بحثوں میں الجھنے کے لئے میرے پاس وقت کہاں ہے۔ بقول اکبر:

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

یہ وہ زمانہ تھا جب حصولِ پاکستان کی تحریک جاری تھی۔ اس تحریک سے میری اور دیگر ہمنوا حضرات کی وابستگی اس بنا پر تھی کہ ہمارے نزدیک

---

[1] "خدا پرستی" سے مقصود خدا کو پوجا نہیں بلکہ خالص قوانینِ خداوندی کی اتباع ہے۔

اس خطۂ ارض میں اسلامی نظامِ زندگی کی از سرِ نو ترویج کے امکانات تھے۔ ہر چند اس وقت یہ توقع کسی کو بھی نہ تھی کہ پاکستان اتنی جلدی ملے گا لیکن یہ امید تو تھی کہ کسی نہ کسی دن یہ نشید کامرانی ہمارے لئے فردوس گوش ضرور بنے گی۔ میرے سامنے سوال یہ تھا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، سب سے پہلا اقدام اسلامی نظامِ حکومت کی ترتیب و تدوین کا ہوگا۔ ضروری تھا کہ اس کے لئے ذہنوں کو ہموار کیا جائے اور اس کے راستے میں جو الجھاؤ اور پیچیدگیاں حائل ہونے والی تھیں انھیں رفتہ رفتہ صاف کر دیا جائے تاکہ جب اس نظام کی عملی تشکیل کا وقت آئے تو اس کی ترتیب میں دقت پیش نہ آئے۔ میں ڈرتا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس وقت کثرتِ تعبیر سے یہ خواب پریشاں سے پریشاں تر ہو جائے[1] اور جس طرح ترکوں نے انہی دشواریوں سے تنگ آکر، نظامِ شریعت کو ناممکن العمل سمجھ لیا اور اپنے آئین و دساتیر کے نقشے معمارانِ مغرب سے مستعار لے لئے، یہاں بھی ایسا ہی نہ ہو جائے اور ہم نے پاکستان سے جس قدر امیدیں باندھ رکھی ہیں، وہ موہوم خواب اور نگاہ فریب سراب سے زیادہ ثابت نہ ہوں۔ لہٰذا میں نے جو بحث چھیڑی تھی وہ نظری بحث نہ تھی بلکہ یکسر عملی نتیجہ کی طرف لے جانے والے مذاکرات تھے۔ چنانچہ آج اسلامی نظام کی تشکیل و ترویج کے متعلق جو آوازیں چاروں طرف سے اٹھ رہی ہیں وہ اس حقیقت پر شاہد ہیں یہ بحث یکسر عملی حیثیت لئے ہوئے تھی۔

اسلامی نظام، نہایت سیدھے سادے اصولوں پر قائم اور آئینۂ فطرت کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اس میں کہیں کثافت نہیں ٹیڑھ نہیں، سلوٹ نہیں، جھول نہیں۔ ما تریٰ فی خلق الرحمٰن من تفوت۔ جن چیزوں کے اندازے خدا نے مقرر کر دیے ہیں ان میں کہیں نقص و تفاوت نہیں ہوا کرتا۔ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور۔ جدھر جی چاہے نگاہ اٹھا کر دیکھ لیجئے کہیں کسی گوشے اور کونے میں بھی فطور نظر نہیں آئے گا۔ ایک بار نہیں بار بار نگاہ اٹھا کر دیکھو ینقلب الیك البصر خاسئاً وھو حسیر۔ ہر بار نگاہ ناکام و نامراد کاشانۂ چشم میں لوٹ آئے گی اور کہیں کوئی الجھاؤ نہیں پائے گی۔ جس قدر الجھاؤ اور پیچیدگیاں، جتنی دشواریاں اور پریشانیاں جس قدر اختلافات و نزاعات، جتنی فرقہ بندیاں اور گروہ سازیاں ہیں سب ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے دُرد و صاف　　رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے میں ہے

اسلامی نظام کی بنیاد

اسلامی نظام کی بنیاد اس حقیقتِ کبریٰ پر ہے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ اس اصل الاصول میں احترامِ آدمیت اور انسانی مساوات کا راز پوشیدہ ہے۔ اطاعت صرف قانونِ خداوندی کی ہو سکتی ہے اور کسی کی نہیں۔ حکومت کا حق صرف اس احکم الحاکمین کے ضابطۂ قوانین کو ہے اس میں کوئی شریک و سہیم نہیں۔ ولا یشرك فی حکمہ احداً (کہف)

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے　　حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

---

[1] چنانچہ تجربے نے بتا دیا کہ تشکیلِ پاکستان کے بعد، تدوینِ دستورِ اساسی کے ضمن میں بھی کچھ ہوا (اور ہو رہا ہے)۔ البتہ طلوعِ اسلام کی طرف سے جو مسودہ دستورِ اساسی مرتب کر کے مجلسِ آئین ساز کے پاس بھیجا گیا ہے اس کی اساس و بنیاد وہی تصورات تھے جو محترم پرویز صاحب کی قرآنی فکر کے پیدا کردہ ہیں۔ طلوعِ اسلام

قرآن کریم کی تعلیم اس باب میں ایسی صاف اور واضح ہے کہ اس کے متعلق کسی لمبی چوڑی بحث کی ضرورت نہیں۔ چونکہ میرا خطاب اس وقت مسلمانوں سے ہے جن کا اس حقیقتِ کبریٰ پر ایمان ہے، اس لئے مجھے اس کے متعلق لکھنے کی ضرورت نہیں کہ حکومت کا یہ اصول کس طرح نوعِ انسانی کو داخلی اور خارجی کشمکش سے نجات دلا کر حریت و آزادی کی صحیح فضا پیدا کر دیتا ہے جس میں انسانیت پروان چڑھتی پھولتی اور پھلتی ہے۔ اس وقت مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ اسلام میں حکومت اور اطاعت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے اور کسی کو نہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی اطاعت کس طرح کی جائے۔ وہ ہر فرد کو براہ راست تو کوئی حکم نہیں دیتا، نہ ہی ہم سے ہمکلام ہوتا ہے۔ تو پھر اس کی اطاعت کا ذریعہ کیا ہے؟ اس کا جواب بھی صاف اور واضح ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جن قوانین کی اطاعت چاہتا ہے وہ اس نے بوساطت جناب نبی اکرمؐ انسانوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ انہی قوانین و ضوابط کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی بار بار صراحت کر دی ہے کہ اس کی اطاعت، قرآنی نظام کی اطاعت سے ہوگی۔ لہٰذا اسلامی نظامِ حکومت کی اساس قرآن کی اطاعت ہے۔ حکومت اسی کے مطابق قائم کی جائے گی۔ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸) "ان میں قرآن کے مطابق (جو اللہ نے نازل کیا ہے) حکومت قائم کرو۔" جو ایسا نہ کرے اسے اسلام سے کچھ واسطہ نہیں۔ وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴) "جو قرآن کے مطابق (جو اللہ نے نازل کیا ہے) حکومت قائم نہ کرے تو وہ کافر ہے۔"

قرآن کا انداز

قرآن خدا کی طرف سے آخری کتاب ہے جو انسانوں کو دی گئی ہے۔ اب غور کیجئے کہ چھٹی صدی عیسوی سے لیکر (کہ جب قرآن نازل ہوا) قیامت تک کس قدر مختلف زمانے آئیں گے اور ان زمانوں میں کس قدر مختلف طبقات کے لوگ ہوں گے۔ قرآن، تمام نوعِ انسانی کے لئے، تمام زمانوں کے لئے، خدائی حکومت کا جامع ضابطۂ قوانین ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف زمانوں میں انسانوں کی تمدنی زندگی (Social Life) کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں انسانوں کے طریق بود و ماند اور اسلوب معاش و معاشرت بدلتے رہتے ہیں۔ آج رسائل آمد و رفت کی وسعتوں سے ساری دنیا کی طنابیں کھنچ گئی ہیں جس سے انسانوں کے بین الاقوامی روابط و معاملات اس نہج و انداز کے ہو گئے ہیں کہ ہزار سال قبل اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آج دنیا کی کوئی قوم خود مکتفی (Self - Sufficient) اور دوسروں سے مستغنی (INDEPENDENT) نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ عصرِ حاضر کے تمدنی تقاضے ازمنۂ سابقہ کے تقاضوں سے مختلف ہوں گے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے۔ لہٰذا ان میں مرورِ زمانہ سے تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً انسان کی طبیعی زندگی کو لیجئے۔ جس طرح چھٹی صدی عیسوی کے زمانے کے انسان کی پیاس پانی سے بجھتی تھی، اسی طرح آج کے انسان کی پیاس کی تسکین بھی پانی ہی سے ہوتی ہے۔ یا اکرمین ذوق و نظر (APPRECIATIVE WORLD) میں جس طرح نزہت و لطافت ہزار سال پہلے کے انسان کے لئے وجہ شادابی قلب و نگاہ تھی، اسی طرح آج کے انسان کے لئے باعثِ شگفتگی دیدہ و دل ہے یا اسی اصول کے تابع، جس طرح صداقت و شرافت ہزار سال پہلے کے انسان کیلئے باعث فخر و مباہات تھی اسی طرح آج کے انسان کے لئے بھی وجہ تکریم و تفضیل ہے۔ ان چیزوں پر

زمانے کی تبدیلی کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ

(۱) انسانی زندگی کے بنیادی تقاضے ایسے ہیں جو ماحول سے متاثر نہیں ہوتے اور مرورِ وقت سے ان میں تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں پڑتی۔

(۲) لیکن اس کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کے ایسے تقاضے بھی ہیں جو زمانے کی ضروریات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔

لہٰذا جس ضابطۂ قوانین و ضوابط کو تمام انسانوں کے لئے اور تمام زمانوں کے لئے، نظامِ زندگی بننا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ان ہر دو تقاضوں کی تسکین کا سامان اپنے اندر رکھے۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو وہ کسی خاص وقت کے لئے نظامِ زندگی بن سکے گا۔ چونکہ قرآن ایک ایسا نظامِ حیات پیش کرتا ہے (دین کے معنی ہی نظامِ حیات ہیں) جو انسانی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہے اور زمان و مکان کی تقیدات سے ماوراء۔ اس لئے ۔ ۔ ۔ اس میں انسانی زندگی کے ان بنیادی اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ یعنی اس میں

(۱) بعض اصول ایسے ہیں جن کی جزئیات بھی متعین کر دی گئی ہیں۔ یہ وہ احکام ہیں جن پر مرورِ زمانہ کا کچھ اثر نہیں ہوگا اور وہ ہمیشہ کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل ہوں گے، ایسے احکام بہت تھوڑے ہیں۔

(۲) باقی اصول ایسے ہیں جن کی صرف حدود متعین کر دی گئی ہیں۔ جزئیات متعین نہیں کی گئیں۔ ان کی جزئیات، ہر زمانے کے انسان اپنی اپنی ضروریات (یعنی اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں) کے مطابق خود متعین کریں گے۔ اس شرط کے ساتھ کہ یہ جزئیات، ان حدود سے متصادم نہ ہوں۔

مثلاً قرآن میں زانی، سارق، ڈاکو، باغی کی سزا متعین ہے۔ وضو کی تفصیل موجود ہے۔ جب کوئی انسان بلا وصیت مر جائے یا اس کی وصیت پورے ترکہ کو محیط نہ ہو تو تقسیمِ ترکہ کے حصے مقرر ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات کی تعین سے منشاءِ خداوندی یہی ہے کہ ان میں تغیر و تبدل نہیں ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ دوسری طرف، مثلاً نظامِ اقتصادیات میں قرآن نے ایک اصول بیان فرمایا ہے کہ روپیہ کی گردش اس طرح ہونی چاہئے کہ وہ محض اوپر کے طبقے میں ہی نہ پھرتا رہے۔ کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ (۵۹/۷) یہ ایک محکم اصول ہے جو بطور اصول قیامت تک کیلئے کارفرما رہ سکتا ہے لیکن وہ جزئی قواعد جن سے یہ مقصد حاصل ہو مختلف زمانوں میں بدلتے رہیں گے اس لئے قرآن نے ان کی تفاصیل و جزئیات سے بحث نہیں کی۔ یا مثلاً محاصل حکومت (Govt. Revenues) کے سلسلے میں اس نے زکوٰۃ کا ذکر بار بار کیا ہے۔ لیکن سارے قرآن میں دیکھ جائیے کہیں بھی اس کی شرح (Rate) مقرر نہیں کی گئی۔ ظاہر ہے کہ یہ شرح، مختلف زمانوں کی حکومت کی ضروریات کے مطابق بدلتی رہے گی[1]۔ زکوٰۃ کی شرح کو بلا تعین چھوڑ دینے سے یہ صاف ظاہر ہے کہ منشاءِ خداوندی یہی ہے کہ اس کی شرح، حکومت اسلامی اپنی ضروریات کے مطابق خود متعین کر لے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اگر اس کے اصول کی طرح، اس کی شرح بھی ناقابلِ تغیر ہوتی تو قرآن نے جہاں اتنی مرتبہ زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہے۔ وہاں ایک آدھ آیت میں اس کی شرح کا تعین بھی کر دیتا۔ اللہ کے لئے یہ کونسی مشکل بات تھی؟

---

[1] زکوٰۃ کی شرح و حقیقت کے متعلق میرا ایک مبسوط مضمون طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکا ہے اسے ایک نظر ضرور دیکھ لینا چاہئے۔

لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ جن اصولوں کی جزئیات، قرآن نے متعین نہیں کیں، اس سے منشا ایزدی یہی ہے کہ ان کی جزئیات مختلف زمانوں کے تقاضوں کے مطابق ادلتی بدلتی رہیں گی، اس لئے اپنے اپنے زمانے کی اسلامی حکومت ان کی تفاصیل خود طے کرے گی۔ ان جزئیات کا نام شریعت ہوگا یعنی قانونِ حکومتِ اسلامی۔ پھر سمجھ لیجئے کہ شریعت، یعنی قانونِ حکومتِ اسلامی مشتمل ہوگی:۔

(۱) ان ناقابل تغیر جزئیات پر جو قرآن نے خود متعین کر دی ہیں اور جو معدودے چند ہیں۔ اور

(۲) ان تفاصیل و جزئیات پر جو قرآنی اصولوں کے دائروں کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانے کی ملت اسلامیہ، قرآنی قاعدوں کے مطابق خود وضع کریگی۔

اس خاکے کو سامنے رکھ کر آگے بڑھئے۔

پہلی قرآنی حکومت قرآن نازل ہونے کے بعد سب سے پہلی حکومتِ خداوندی، نبی اکرمؐ نے تشکیل فرمائی۔ اس کے لئے حضورؐ نے

(۱) ان احکام کو بجنسہٖ نافذ فرمایا جو قرآن میں بالتفصیل آئے ہیں۔ یعنی جن کی جزئیات قرآن نے متعین کر دی ہیں۔ اور

(۲) جن اصولوں کی جزئیات قرآن نے متعین نہیں کیں، ان کی جزئیات اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق متعین فرمائیں۔ اس زمانے میں ہنوز تمدنی وسعت اتنی زیادہ نہ تھی جو مختلف النوع معاشرتی اقتضایات کا موجب بنتی۔ وہ سیدھا سادہ دور تھا اسلئے اس میں تفصیلی احکام کی ایسی کثرت نہ تھی جیسی بعد میں جا کر ہوئی۔ لہٰذا حضورؐ کی متعین فرمودہ جزئیات بھی کچھ زیادہ نہ تھیں۔

ان ہی دونوں کے مجموعے کا نام شریعت اسلامی، یا ضابطۂ قوانین حکومت خداوندی تھا۔ اس ضابطہ کی اطاعت حکومتِ حقہ کی اطاعت یعنی خدا اور رسول کی اطاعت تھی۔

نبی اکرمؐ نے قرآن کریم کو نہایت محفوظ شکل میں لکھوا کر، اور حفاظ کو حرف بحرف یاد کرا کر اور ان کا یاد کیا ہوا خود سن کر، امت کے حوالے کر دیا۔ اور خود اللہ نے اس کی حفاظت کا ذمہ لے لیا۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ "ہم نے قرآن نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ باقی رہیں وہ جزئیات جو شق ۲ کے مطابق حضورؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے پیش نظر خود متعین فرمائی تھیں چونکہ وہ ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لئے متعین نہیں کی گئی تھیں، اس لئے حضورؐ نے نہ ان جزئی احکامات کو کہیں قلمبند کرایا نہ انھیں کسی کو حفظ کرایا، نہ ان کا کوئی مجموعہ امت کو دیا۔ اور چونکہ صحابہ کبارؓ اس حقیقت سے واقف تھے اس لئے نہ انھوں نے اس کا مطالبہ کیا اور نہ ہی کسی ایسے مجموعے کو مدون کرنے کی کوشش کی۔ چنانچہ کتب تاریخ و آثار اس پر شاہد ہیں کہ نبی اکرمؐ نے قرآن کے سوا امت کو اور کوئی مجموعۂ احکام نہیں دیا۔ اور مذکورہ صدر تصریحات کی روشنی میں اس کی لِم بھی صاف طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ

جن اصولوں کی جزئیات کو ابدی طور پر ناقابل تغیر و تبدل رکھنا منشائے خداوندی نہ تھا، ان جزئیات کو ابدی طور پر غیر متبدل رکھنا منشائے نبی اکرمؐ کس طرح ہو سکتا تھا؟

رسولؐ اللہ اور خلفائے راشدین کے فیصلوں میں اختلاف اور جب یہ چیز منشائے خداوندی تھی اور (لہٰذا) منشائے رسول اللہؐ

تو حضورؐ ان جزئیات کو قرآن کی طرح محفوظ کرکے امت کو کیوں دیتے؟ رسول اللہؐ کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ حضورؐ کے جانشین ہوئے (خلیفہ کے معنی جانشین ہیں) اب قرآنی اصولِ حکومت کے مطابق، حضرت صدیق اکبرؓ کے فیصلوں کی اطاعت "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت کے مترادف ہوگئی۔ چونکہ آپ کے اور رسول اللہؐ کے زمانے میں بُعد نہیں تھا اور دونوں کے تمدنی مقتضیات ایک ہی تھے اس لئے عام طور پر نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلیوں کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی۔ لیکن بایں ہمہ جن معاملات میں کسی تبدیلی کی ضرورت لاحق ہوئی ان میں تبدیلی بھی کی گئی اور جو نئے امور و قضایا سامنے آئے ان میں نئے فیصلے بھی دیئے گئے۔ کتب روایات و آثار میں ایسی مثالیں موجود ہیں جن میں خلفائے راشدینؓ نے ایسے فیصلے صادر کئے جو نبی اکرمؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں سے مختلف تھے۔ امورِ حکومت میں سب سے اہم معاملہ خلیفہ کا انتخاب تھا۔ حضورؐ نے نہ کسی کو اپنا جانشین منتخب کیا تھا نہ نامزد۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو نامزد فرمایا اور حضرت عمرؓ نے انتخاب کو چھ حضرات میں محدود کر دیا۔ یہ فیصلے ظاہر ہے کہ رسولؐ اللہ کے فیصلے سے مختلف تھے۔ یا مثلاً حضرت عثمانؓ نے جمعہ کی نماز میں دوسری اذان کا اضافہ کیا۔ اسی طرح شراب خوری کی سزا کا تعین نہ قرآن میں ہے نہ حضورؐ کے زمانے میں اس کی تعیین ہوئی۔ اسے حضرت عمرؓ نے صحابہؓ کے مشورے سے متعین کیا۔ حضرت عمرؓ کے متعلق کتب آثار میں ہے کہ آپ نے جب یہ فیصلہ کیا کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو ایک ہی وقت میں تین طلاقیں دیدیں تو وہ طلاق بائنہ مان لی جائے گی، تو آپ کو معلوم تھا کہ رسول اللہؐ ایسی طلاق کو بائن قرار نہیں دیتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے اسے نافذ قرار دیا اور فرمایا کہ لوگوں نے جو روش اختیار کر رکھی ہے اس کے پیش نظر اب یہی حکم مناسب ہے۔ چنانچہ یہ حکم نافذ[1] العمل ہوا اور شریعت کا حکم قرار پاگیا۔ یعنی رسول اللہؐ کے زمانے میں ایک حکم، حکمِ شریعت تھا اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں، اس کے برعکس دوسرا حکم، حکمِ شریعت قرار پاگیا اور اس وقت اسی حکم کی اطاعت، اطاعت "خدا اور رسول" مانی گئی۔ چنانچہ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے امام ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے کہ

> عہدِ عمرؓ کی سیاست کا تقاضا یہی تھا کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کو بائنہ مان کر فیصلہ کر دیا جائے۔
>
> چنانچہ یہ فیصلہ کرکے آپ نے تحلیل کا دروازہ بند کر دیا تاکہ لوگ حلالہ سے باز رہیں۔

نئے فیصلے

اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب مملکت میں توسیع ہوئی تو اس کے ساتھ ساتھ تمدنی ضروریات میں بھی وسعت ہوگئی اور ایسے ایسے امور اجتماعیہ سامنے آئے جو نبی اکرمؐ کے عہدِ مبارک میں پیش نہ آئے تھے چنانچہ ان معاملات و قضایا کے متعلق نئے نئے احکام وضع کرنے پڑے۔ مثلاً دفاتر کا قیام، جیل خانوں کی تعمیر، سکوں کی ترویج وغیرہ۔ اس باب میں امام ابن قیم اپنی کتاب "الطرق الحکمیہ" میں ابن عقیل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

> سیاست کی تعریف یہ ہے کہ یہ وہ فعل ہے کہ جس کے ذریعے عوام اصلاح سے قریب ہو جائیں اور فتنہ و فساد سے دور۔ اگرچہ اس معاملہ کی

---

[1] مجھے اس وقت حضرت عمرؓ کے اس اجتہادی فیصلہ پر بحث مقصود نہیں۔ اس وقت تو صرف اتنا بتانا ہے کہ اصولی طور پر خلفائے راشدین اس حقیقت سے آشنا اور اس پر عمل پیرا بھی تھے کہ نبی اکرمؐ کی متعین فرمودہ جزئیات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ جزئیات ابدی طور پر غیر متبدل رہنے کے لئے وضع نہیں کی گئی تھیں۔ (طلاق کی صحیح قرآنی صورت کیا ہے، اس کے متعلق طلوع اسلام میں تفصیل سے لکھا جا چکا ہے۔

متعلق نہ قرآن میں واضح حکم موجود ہو نہ حدیث میں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سیاست وہی ہے جس کی شرع نے وضاحت کر دی ہے، یہ بات بالکل غلط ہے۔ خود صحابہ کرامؓ نے اس کی تغلیط کی ہے۔ سچ پوچھو تو اجتہاد رائے کا یہ سلسلہ عہد خلفائے راشدین سے چلا آرہا ہے۔ حضرت علیؓ نے چند زنادقہ کو جلایا، حضرت عثمانؓ نے قرآن کے جو غیر معمولی مصاحف کو جلایا، حضرت عمرؓ نے جو نصر بن حجاج کو جلاوطن کیا۔ یہ سب اگر اجتہاد رائے نہیں تھا تو اور کیا تھا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ خود نبی اکرمؐ نے جن جزئیات کو متعین فرمایا تھا ان کا دائمی طور پر ناقابل تغیر و تبدل رکھا جانا مقصود نہ تھا نہ ہی تمام کی تمام شریعت ان ہی جزئیات کے اندر محصور ہو چکی تھی۔ اسلامی حکومت اپنے زمانے کے اقتضایات کے پیش نظر ان میں تبدیلیاں بھی کر سکتی تھی بدن پر اضافے بھی۔ ناقابل تغیر صرف قرآن کے اصول اور اس کی متعین کردہ جزئیات تھیں (اور ہیں) چنانچہ جہاں ہمارے سامنے ان جزئیات میں تغیر و تبدل اور حک و اضافے کے واقعات آتے ہیں جنہیں قرآن نے متعین نہیں کیا تھا، وہاں یہ واقعہ بھی تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اپنی بیویوں کے مہر بڑھ چڑھ کر باندھ رہے ہیں تو آپ نے چاہا کہ مہر کی کوئی حد متعین کر دی جائے۔ آپ نے مسجد میں لوگوں کے سامنے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تو ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ اے عمرؓ! کیا کہہ رہے ہو؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتا ہے کہ

واتیتم احدٰھن قنطارا فلا تأخذ و منہ شیئاً

اگر تم نے ان بیویوں میں سے کسی کو مال کا ڈھیر بھی بطور مہر دیدیا تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو۔

آپ نے سن کر کہا کہ اس عورت نے سچ کہا۔ عمر غلطی پر تھا۔

ایک خلیفہ کے فیصلے کے خلاف دوسرے خلیفہ کا فیصلہ

خلافت راشدہ میں ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں کہ ایک خلیفہ کے فیصلہ کے خلاف دوسرے خلیفہ نے فیصلہ دیا ہو۔ مثلاً

(۱) قرآن نے صدقات میں سے ایک حصہ مؤلفۃ القلوب کا بھی رکھا ہے لیکن اس حصہ کا تعین نہیں کیا۔ . . . . نبی اکرمؐ نے اقرع بن حابس اور عیینہ بن حصن کو (جو امرائے قبائل میں سے تھے) ایک بار تالیف قلوب کے لئے سو سو اونٹ عطا فرمائے۔ پھر خلیفہ اول کے عہد میں انھوں نے کچھ زمینیں طلب کیں تو انھیں وہ بھی دیدی گئیں۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس اراضی کو یہ کہہ کر واپس لے لیا کہ اللہ نے اسلام کو تمہاری امداد سے بے نیاز کر دیا ہے اس لئے وہ زمینیں اب ان کے حقداروں کو دی جائیں گی۔

(۲) حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک مطلقہ عورت نے اپنی عدت کے زمانے میں نکاح کر لیا (حالانکہ قرآن میں اس کی ممانعت آئی ہے) اس پر حضرت عمرؓ نے اس کے شوہر کے کوڑے لگوائے اور فیصلہ صادر فرمایا کہ جو عورت اپنی عدت کے زمانے میں نکاح کرے اگر اس کے شوہر کی اس کے ساتھ مقاربت نہیں ہوئی، تو دونوں میں علیحدگی کرا دی جائے گی۔ لیکن بعد میں یہ شوہر اس کے ساتھ نکاح کر سکتا ہے۔ لیکن اگر مقاربت ہو چکی ہو تو اس علیحدگی کے بعد وہ اس سے نکاح نہیں کر سکتا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کے جزو ثانی سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ بعد اختتام عدت

اس شوہر سے نکاح جائز ہوگا خواہ مقاربت ہوئی ہو یا نہ۔

(۳) حضرت عثمانؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ آزاد عورت، غلام کی بیوی ہو کر صرف دو طلاقوں سے دائمی طور پر حرام ہو جائے گی لیکن حضرت علیؓ نے اس فیصلہ کی مخالفت کی اور فرمایا کہ وہ تین طلاق سے کم میں حرام نہیں ہوگی۔

(۴) اگر کوئی مرد حالتِ مرض میں اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو حضرت عمرؓ کے فیصلے کے مطابق اس عورت کو متوفی کے ترکہ سے اسی صورت میں حصہ ملے گا کہ اس کا خاوند عدت کے زمانے میں فوت ہو جائے۔ اگر عدت کی مدت گذر جائے تو پھر متوفی کے ترکہ سے اسے کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن حضرت عثمانؓ نے فیصلہ دیا کہ اس باب میں حد مقرر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ بہر حال ترکہ کی مستحق ہوگی۔

(۵) جس حاملہ عورت کا شوہر مر جائے حضرت عمرؓ نے اس کی عدت وضع حمل مقرر کی۔ لیکن حضرت علیؓ کا فیصلہ ہے کہ وضع حمل اور چار مہینے دس دن کی مدت میں جو نسی مدت طویل ہوگی وہی اس کی عدت ہے۔

(۶) دادا کی موجودگی میں حضرت ابوبکرؓ بھائیوں کو وراثت نہیں دلواتے تھے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ایسی حالت میں بھائیوں کو وراثت دلوائی۔

(۷) حضرت ابوبکرؓ لوگوں پر برابر برابر مال تقسیم کراتے تھے اور کسی کو کسی دوسرے پر ترجیح نہیں دیتے تھے۔ یہی رسول اللہؐ کے زمانے میں ہوتا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ترجیحی حقوق قائم کئے اور فرمایا کہ جن لوگوں نے رسول اللہؐ کے خلاف جنگ کی ہے وہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہو سکتے جو حضورؐ کے ساتھ شریک جہاد ہوئے۔ لیکن حضرت علیؓ نے پھر اس امتیاز کو مٹا دیا۔

اس قسم کے اور بہت سے واقعات کتب تاریخ و آثار میں مذکور ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ ایک خلیفہ ... کی متعین کردہ جزئیات کو ناقابل تغیر و تبدل نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ایک خلیفہ کا فیصلہ اس کے اپنے زمانے کے لئے شریعت ہوتا تھا، اس کے بعد آنے والے کا فیصلہ اس کے زمانے والوں کے لئے شریعت۔

ازاں بعد! خلفائے راشدین کے بعد خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی جس کا لازمی نتیجہ "دین اور دنیا" کی تفریق تھا۔ رفتہ رفتہ صورت یہ ہو گئی کہ بادشاہوں نے (جو اپنا نام خلیفہ ہی رکھتے تھے) "امورِ دنیا" کی سرانجام دہی کا فریضہ اپنے ذمے رکھا اور "امورِ دینی" فقہا کے سپرد ہوتے گئے۔ نتیجہ یہ کہ اسلامی نظام کا وہ اصل الاصول جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے، بتدریج نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ شریعت کی جزئیات متعین کرنے کا فریضہ انفرادی نہیں بلکہ ملت کا اجتماعی منصب تھا جس کی تکمیل مجلس شوریٰ اور امیر ملت کے فیصلوں سے ہوتی تھی۔ اب نہ امیر ملت تھا نہ اس کی مجلس شوریٰ، اس لئے جزئیات کی تعیین کس طرح ہوتی؟ ... اب لوگ فقہا کے پاس اپنے اپنے امور و قضایا لاتے۔ وہ پہلے قرآن کی طرف نگاہ دوڑاتے۔ اگر اس کی متعین کردہ جزئیات سے بات طے ہو جاتی تو ہو المراد ورنہ وہ عہد رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ کے فیصلوں میں تفحص کرتے۔ اور اگر وہاں بھی مناسب حال کوئی فیصلہ نہ ملتا تو مجبوراً خاموش رہتے۔ اس ضرورت کے ماتحت نبی اکرمؐ اور عہد صحابہؓ کے احوال و کوائف اور اقوال و اعمال کی جمع و تدوین کا خیال پیدا ہوا۔

روایات

ان ہی مجموعوں کا نام کتبِ روایات ہے۔ چنانچہ ان میں سب سے پہلا مجموعہ جو آج ہمارے پاس ہے مؤطا امام مالکؒ ہے جو تقریباً ۱۶۰ھ میں مدون ہوئی۔ اس میں کم و بیش پانچ سو روایات ہوں گی جو بیشتر احکام ہی پر مشتمل ہیں۔ بنی عباس کے عہدِ حکومت میں، سلطنت بہت وسیع ہوگئی اور تمدن کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں نے نئے نئے مسائل پیش کردیئے جن کا حل روایات عہد رسالتمآبؐ اور خلافت راشدہ میں نہیں مل سکتا تھا۔ اور فقہا کے لئے یہ بھی مشکل تھا کہ ہر نئے معاملہ میں خاموشی اختیار کرلیں۔ اس ضرورت کے ماتحت روایات وضع ہونی شروع ہوئیں اور سو سال کے عرصہ میں (جس . . میں صحیح بخاری اور صحیح مسلم مدون ہوئی ہیں۔ یعنی نبی اکرمؐ کے قریب اڑھائی سو سال بعد) ان کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ ایک امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث جمع کیں اور ان میں سے قریباً سات ہزار منتخب کر کے اپنا مجموعہ مرتب کیا۔ اس ضرورت کے علاوہ جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے وضع روایات کے لئے اور بھی بہت سے اسباب محرک و مؤید ہوئے لیکن یہ بحث میرے اس موضوع سے خارج ہے۔ مجھے اس وقت صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ دینی لامرکزیت سے جب جزئیات شرعیہ کی تعیین کا دروازہ بند ہوا تو لوگوں کو کس طرح مجبوراً سابقہ متعین شدہ جزئیات پر اکتفا کرنا پڑا اور جب وہاں سے ہر مسئلہ کا جواب نہ ملا تو ان روایات میں کس طرح اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔

فقہ

لیکن ان کے ساتھ اہل فکر کا ایک اور گروہ بھی تھا جس نے ایسے مقامات پر خاموش رہنے یا وضعی حدیثوں کی طرف رجوع کرنے کی بجائے اس مشکل کا ایک اور حل سوچا۔ ان کے سامنے جب کوئی نیا سوال آتا تو وہ قرآن یا روایات کو سامنے رکھ کر قیاساً استنباط کرتے اور اس طرح اپنی فکر اور رائے سے مسئلہ پیش نظر کا حل متعین کر لیتے۔ گروہ اول اہلحدیث کے نام سے متعارف ہوا۔ اور گروہ ثانی اہل الرائے یا اہل فقہ کہلایا۔ موخرالذکر گروہ میں امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد امام ابویوسف بغداد کے قاضی القضاۃ مقرر ہوئے تو ان کی قابلیت و تفقہ سے ان کی فقہ دولت عباسی کا رسمی قانون بن گئی۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس فقہ میں اور وسعت پیدا ہوتی گئی۔ یہی وہ فقہ ہے جو فقہ حنفی کے نام سے متعارف ہے۔ واضح رہے کہ یہ فقہ، ملت کی مجلس شوریٰ اور ان کے منتخب کردہ امام کے تفقہ فی الدین کے اجتماعی فیصلے نہ تھے جو عہدِ اولیٰ میں شریعت کی جزئیات بنتے تھے۔ یہ ائمہ فقہ کے انفرادی تفقہ و تدبر کے نتائج تھے۔ جنہیں حکومت اپنے مقاصد کے ماتحت بطور قانون رائج کر دیا کرتی تھی۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کسی قانون کے محرکات، خاص مقاصد و مصالح ہوں تو اس کا اصول سے دور ہٹ جانا مستبعد نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس مجموعۂ فقہ میں نہ معلوم کس کس گوشے کے فیصلے اور کون کون سے امیال و عواطف کے قضایا شامل ہوتے رہے۔ ملوکیت کا استبداد جو کچھ زندگی کے اور شعبوں میں کیا کرتا ہے وہی کچھ یہاں بھی ہو یعنی وضعی حدیثوں کی طرح فقہ کے مجموعۂ فتاویٰ میں بھی ایسی ایسی چیزیں شامل ہوگئیں جو کھلے طور پر قرآن کے خلاف جاتی ہیں۔

اس طرح احادیث اور فقہ کے مجموعے مرتب ہوئے۔

دین، مذہب سے بدل گیا

زوالِ بغداد کے بعد، ملت کی دنیاوی مرکزیت بھی ختم ہوگئی اور تشتت و افتراق کی اس عالمگیر افراتفری میں دین، یکسر مذہب میں تبدیل ہو کر چند منتشر عقائد اور رسومات کے مجموعہ کا نام رہ گیا

(واضح رہے کہ دین) رفتہ رفتہ مذہب میں تو اسی زمانے سے بدلنا شروع ہو گیا تھا جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی۔ زوالِ بغداد کے بعد اس سلسلہ کی تکمیل ہو گئی تھی) علماء نے اپنی عظمت قائم رکھنے کے لئے مختلف مراکز قائم کر لئے اور امت سے کہہ دیا گیا کہ وہ مذہب سے متعلق ہر معاملہ کے لئے ان ہی مراکزِ عقیدت کی طرف رجوع کیا کریں۔ اس طرح مسلمانوں میں خالص برہمنیت (PRIEST HOOD) قائم ہو گئی جو ان کی زندگی کے ہر اس شعبہ پر جو مذہب سے متعلق تھا پورے طور پر چھا گئی۔ اگرچہ ان علماء میں باہمی اختلافات بیحد تھے اور مختلف فرقوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں مسلمان اصولی طور پر دو گروہوں میں منقسم تھے یعنی اہلِ حدیث اور اہل الرائے یا اہلِ فقہ۔ ان دونوں گروہوں کی باہمی چپقلش و آویزش ملت اسلامیہ کی بدبختی کی ایک مستقل داستان ہے۔ گروہ سازی کا خاصہ ہے کہ انسان ان امتیازات میں جن سے اس کا فرقہ دوسرے فرقے سے متمیز ہوتا ہے بڑا تشدد برتتا ہے کیونکہ اسی سے اس کا فرقہ قائم رہ سکتا ہے۔ اسی کا نام تعصب ہے۔ یہی تعصب اختلافات کو مستقل اور دائمی حیثیت دے کر ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کا موجب بن جاتا ہے۔ نیز جب کسی قوم پر زوال آتا ہے تو اس کی زندگی کا ہر شعبہ انحطاط پذیر ہو جاتا ہے اور اس کا اثر خاص طور پر اس کی فکری صلاحیتوں پر پڑتا ہے۔ چونکہ قوم میں جدت افکار و قوت تخلیق باقی نہیں رہتی اس لئے وہ تقلید جامد کو مسلکِ زندگی قرار دے لیتی ہے اور اپنے اس افلاسِ فکر و نظر اور فقدانِ تدبر و اجتہاد کو "اسلاف پرستی" کا مقدس نام دے کر خوش ہونے لگتی ہے . . . . . . اسلاف پرستی کے لئے ضروری ہے کہ گزرے ہوئے زمانے کو اپنے زمانے سے مقدس و مزکی قرار دیا جائے اور اپنے ماضی کو درخشندہ اور حال و مستقبل کو تاریک بتایا جائے۔ زوالِ بغداد کے بعد یہ تمام خرابیاں ابھر کر سطح پر آ گئیں اور علماء نے امت کو یہ کہہ کر سلا دیا کہ

(۱) مذہب جو کچھ بننا تھا بن چکا۔ جتنا کچھ سمجھا جانا تھا سمجھا جا چکا۔ اب اس میں نہ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے نہ حک و اضافہ۔

(۲) یہ مذہب، علماء کو اسلاف سے وراثت میں ملا ہے اس لئے اسے علماء ہی سمجھ سکتے ہیں۔

(۳) تمہارے لئے ضروری ہے کہ تم مذہب کے ہر معاملہ میں علماء کی طرف رجوع کرو اور ان کے فیصلوں کو خدا اور رسول کا فیصلہ سمجھو۔

(۴) چونکہ عقل کو مذہب میں کوئی دخل نہیں اسلئے اگر علماء کا کوئی حکم تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو اس کے سمجھنے پر اصرار نہ کرو۔

(۵) بزرگوں کے راستے پر آنکھ بند کر کے چلتے جاؤ کہ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جو تمہیں سیدھا جنت کی طرف لیجائے گا۔

(۶) یاد رکھو تمہارا زمانہ فسق و فجور کا زمانہ ہے اس میں گنہگار رہتے ہیں۔ تمہارے اسلاف کا زمانہ علم و تقویٰ کا زمانہ تھا اسلئے تم گنہگار اس کے اہل ہی نہیں کہ مذہب کے معاملات میں دخل دے سکو۔ اگر اسلاف کا کوئی فیصلہ قرآن کے خلاف نظر آئے تو اسے اپنی نظر کا قصور سمجھو کیونکہ اسلاف تم سے زیادہ قرآن فہم تھے۔

ان لوریوں سے انھوں نے قوم کو سلا دیا اور اس طرح ان کے دل کی گہرائیوں میں اپنی مسانید برہمنیت کی عظمت بٹھا دی۔ واشربوا فی قلوبھم العجل۔

اب انھیں قوم کی طرف سے تو کسی حملہ کا اندیشہ نہیں رہا تھا مگر . . اپنے باہمی اختلافات کے باعث ایک دوسرے کی طرف سے ہراساں ضرور تھے۔ اس کے لئے انھوں نے جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، عقائد میں شدت اور تعصب پیدا کرنے کی کوشش کی تاکہ

ان کے متبعین، ان عقائد میں ذرا سی لغزش یا تبدیلی کے خیال سے کانپ اٹھیں اور اس میں انھیں ایمان جاتا دکھائی دے۔ چنانچہ اہلِ فقہ کے مقابلہ میں احادیث کو عین اسلام بنانے کے لئے یہ عقائد وضع کئے گئے کہ

(۱) احادیث بھی دراصل منزل من اللہ ہیں اس لئے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وحی متلو (جس کی ہم قرآن میں تلاوت کرتے ہیں) اور دوسری غیر متلو جو احادیث میں ہے۔

(۲) جن باتوں کی صراحت قرآن میں نہیں ہے انھیں اللہ نے اس لئے مجمل چھوڑ دیا تھا کہ رسول اللہؐ اس اجمال کی تفصیل متعین کر دیں (اس طرح کتابِ دین گویا دو مصنفوں کی مشترکہ تصنیف قرار پا گئی) چنانچہ امام اوزاعی کا قول ہے کہ قرآن اس سے زیادہ حدیثوں کا محتاج ہے جس قدر کہ حدیثیں قرآن کی۔ (دیکھئے مختصر جامع بیان العلم)

(۳) قرآن میں جہاں اللہ اور رسول کی اطاعت کا حکم ہے اس سے مراد قرآن اور احادیث کی اطاعت ہے۔ لہٰذا احادیث قرآن کی مثل (مثلہٗ معہٗ[1]) ہیں اور قرآن ہی کی طرح ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل۔ بلکہ قرآن کو حدیث منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

(۴) جب یہ اعتراض کیا گیا کہ احادیث میں ایسی چیزیں بھی ملتی ہیں جو قرآن کے خلاف[2] ہیں تو یہ کہا گیا کہ حدیث قرآن پر قاضی ہے اور قرآن حدیث پر قاضی نہیں یعنی اگر قرآن اور حدیث میں دو باتیں باہم متعارض ہوں تو حدیث کا حکم واجب التعمیل ہوگا۔ (ایضاً)

ان کے مقابلہ میں اہل فقہ بھی اپنے عقائد میں کم متشدد نہ تھے۔ ان کے نزدیک امت کے لئے اب قرآن کا کوئی عملی فائدہ باقی نہ تھا۔ اس میں سے جو کچھ حاصل کرنا تھا وہ ائمہ فقہ نے حاصل کر کے اپنے مجموعۂ فتاوی میں جمع کر دیا۔ اب قرآن کی تلاوت فقط ثواب حاصل کرنے یا مردوں کو بخشنے کے لئے رہ گئی۔ جو جزئیات قرآن نے متعین نہیں کی تھیں، انھیں ائمہ فقہ نے متعین کر دیا اور اب ان کی متعین فرمودہ جزئیات قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ نہ ان میں حک و اضافہ ہو سکتا ہے نہ ادل بدل۔ اس لئے کہ اب مزید اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ حالانکہ خود ائمہ فقہ کا بھی یہ منشاء نہ تھا کہ ان کے تفقہ کے استنباطات و اجتہادات کو ابدی طور پر ناقابلِ تغیر مان لیا جائے۔ ایک ہی نہجِ فکر کی فقہ کے مختلف ائمہ کے باہمی اختلافات اس پر شاہد ہیں کہ وہ اپنے قیاس و آراء کو کبھی منزہ عن الخطا نہیں سمجھتے تھے۔ خود امام اعظمؒ اور ان کے شاگردانِ جلیل امام محمدؒ اور امام یوسف کے قیاسات و استنباطات

---

[1] مثلہٗ معہٗ کے متعلق طلوع اسلام میں ایک مفصل مضمون شائع ہو چکا ہے۔ (طلوع اسلام)

[2] مثلاً قرآن نے زنا کی سزا سو درّے مقرر کی ہے۔ لیکن احادیث میں شادی شدہ زانیوں کی سزا رجم (سنگسار) ہے جو قرآن پر خالص اضافہ ہے۔ یا قرآن نے ہر شخص کو یہ حق دیا ہے (بلکہ اللہ نے اسے فرض قرار دیا ہے) کہ وہ اپنے ترکہ کیلئے وصیت کرے۔ لیکن احادیث کہتی ہیں کہ وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی ورثاء کے لئے نہیں۔ یا قرآن دین کے معاملہ میں جبر و اکراہ نہیں چاہتا۔ ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہے اختیار کرے لیکن احادیث کی رو سے مرتد کی سزا قتل ہے۔ یا قرآن نے جنگی قیدیوں کے متعلق حکم دیا ہے کہ انھیں فدیہ لیکر چھوڑ دو یا احساناً۔ لیکن حدیث کی رو سے جنگی قیدیوں کو قتل کر دینے اور غلام بنا لینے تک کا بھی حکم ہے۔ مسلمانوں میں غلامی آئی ہی روایات کے راستے سے ہے۔ قرآن نے اس کے سب راستے بند کر دیئے تھے ——— یہ احکام کی چند ایک مثالیں ہیں ورنہ جہاں تک دین کی روح کا تعلق ہے عجمی دماغوں میں وضع شدہ روایات نے اسے یکسر مسخ کر دیا ——— ہے۔ اس کی تفصیل میرے اکثر مضامین میں ملے گی۔

میں اختلاف ہوتا تھا۔ علاوہ بریں ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ قرآن و سنت ہی سے اخذِ مسائل کرتے ہیں لیکن ان کی فقہ میں ایسے ایسے فیصلے موجود ہیں جو قرآن کے بھی خلاف جاتے ہیں (اور اہلِ حدیث کے اعتراضات کی رو سے خود سنت رسول اللہ کے بھی خلاف) مثلاً فقہ کی رو سے یتیم پوتے کو دادا کی وراثت میں سے کچھ نہیں ملتا۔ (اس لئے کہ اس کا جرم ہے کہ اس کا باپ، اس کے دادا کی موجودگی میں کیوں مرگیا) حالانکہ یہ فیصلہ قرآن کے خلاف ہے۔ یا غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق تمام احکام، حالانکہ قرآن نے غلامی کو سرے ہی سے مٹا دیا تھا اور صرف ان غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق احکام دیئے تھے جو نزولِ قرآن کے وقت پہلے سے موجود تھے۔ یا مثلاً وراثت کے قانون میں عول کا قاعدہ کہ جس سے انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو (معاذ اللہ) حساب کے ابتدائی قواعد بھی معلوم نہ تھے۔

اب اگر ان سے کہا جائے کہ فقہ کے یہ فیصلے قرآن کے خلاف ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا امام اعظمؒ زیادہ سمجھتے تھے؟ اس جواب کے بعد وہ مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے دین کے گرتے ہوئے ستون کو تھام لیا ہے۔

بہرحال اس طرح احادیث اور فقہ مستقل دین بن گئیں اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل قرار پا کر، واجب العمل ٹھہر گئیں اور ان کی اطاعت کا نام ہوا اللہ اور رسول کی اطاعت۔ حالانکہ ان سے مفہوم صرف یہ تھا کہ رسول اللہؐ کے زمانے سے لیکر مختلف ادوار میں دین کو کس طرح سے سمجھا گیا اور شریعت کی جزئیات کی تعیین میں کیا کیا کوششیں ہوئیں۔ یعنی اگر جعلی روایات کو بھی الگ کر لیا جائے اور فقہ میں جو کچھ ادھر اُدھر سے شامل ہو گیا ہے اس سے بھی قطع نظر کر لی جائے تو بھی ان سے صرف یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم کے فلاں فلاں اصول کے متعلق فلاں فلاں زمانے میں کس قسم کی جزئیات متعین ہوئی تھیں نہ رسول اللہ کا منشا تھا کہ یہ جزئیات ابدی طور پر ناقابلِ تغیر ہیں اور نہ ہی فقہاء کا مقصود تھا کہ ان کی جزئیات قیامت تک کیلئے دین بن جائیں۔ یہ خیال ہی بعد کی پیداوار ہے۔

معاشرتی جزئیات بھی دین بن گئیں

روایات کو دین بنا لینے سے ایک اور خرابی بھی ہوئی۔ نبی اکرمؐ عرب میں پیدا ہوئے اس لئے جس طرح آپ کی زبان عربی تھی اسی طرح آپ کی عام معاشرت اور طریق بود و ماند بھی وہی تھا جو اس زمانے کے عربوں کا تھا۔ اس معاشرت کی ایسی خرابیاں جو اسلام کے خلاف جاتی تھیں ان کی بیشک حضورؐ نے اصلاح فرما دی لیکن اس کے بعد حضورؐ کے رہن سہن کا طریق تو لامحالہ وہی تھا جو اس زمانہ کے عربوں میں مروج تھا۔ وضع قطع، لباس کی تراش خراش، سامانِ نقل و حرکت، اسبابِ حرب و ضرب۔ غرضیکہ روزمرہ کے رہنے سہنے کے طریقے اور برتنے کی چیزیں وغیرہ سب اسی انداز کی تھیں جن کا اس زمانے میں رواج تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ چیزیں جب تک قانون کی کسی شق سے متصادم نہ ہوں، قانون کی حدود میں نہیں جکڑی جاتیں اور ہر زمانے کے معاشرتی انداز کے مطابق اختیار کی جا سکتی ہیں۔ آپ کے کوٹ کی لمبائی کتنی ہونی چاہئے۔ آپ کو جوتا کس قسم کا پہننا چاہئے۔ پانی کس قسم کے برتن میں پینا چاہئے (گلاس میں یا پیالہ میں) وقس علیٰ ہذا۔ یہ چیزیں دین میں داخل نہیں ہیں۔ لیکن جب روایات مرتب ہوئیں تو چونکہ وہ تاریخ تھیں عہدِ رسالتمآبؐ و صحابہ کرامؓ کی، اس لئے اس قسم کے عام معمولات کی باتیں بھی ان میں آ گئیں اور جب بعد میں روایات دین بن گئیں تو یہ چیزیں بھی جزوِ دین قرار پا کر قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر سمجھ لی گئیں۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف معاملات کی دنیا میں قانونی جزئیات میں رد و بدل کرنے کا اختیار ملت سے سلب کر لیا گیا بلکہ روزمرہ کے معمولات میں بھی انہیں ایک خاص وضع کی معاشرت کا پابند کر دیا گیا۔ پاجامہ کتنا لمبا ہونا چاہئے، بالوں کی مانگ کس طرف نکالنی چاہئے۔ مسواک کی لمبائی کتنی ضروری ہے۔ غسل کے لئے کتنے لوٹے پانی چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح وہ دین جسے زمانہ کی فرسودگیوں کا حل تجویز . . . کرنا چاہئے تھا، ظواہر پرستیوں (RITUALISM) کا ایسا سخت مجموعہ بن گیا جس میں کہیں لوچ اور لچک نہیں۔ اگر کسی مولوی صاحب کو معلوم ہو جائے کہ میت کے غسل کے پانی میں بیری کے پتے نہیں ڈالے گئے، تو وہ جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیں گے۔ یہودیوں کے تالمود کو اٹھائیے۔ ہندوؤں کے شاستروں کو دیکھئے۔ ایک ایک رسم کی ادائیگی میں کتنی کتنی جانکاہ پابندیاں لگائی گئی ہیں۔ ان کے ہاں مذہب کی کوئی رادھا ناچ نہیں سکتی جب تک نو من تیل نہ ہو۔" قرآن نے حضورؐ کی بعثت کا مقصد . . . یہ بتایا ہے کہ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (۷/۱۵۷)، کہ وہ رسولؐ کافۃ للناس۔ انسانوں کو اس بوجھ سے آزاد کر دے گا جس کے نیچے وہ دبے ہوئے تھے اور ان اطواق و سلاسل کو اتار کر پھینک دے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ یہ اطواق و سلاسل، ملوکیت کا استبداد اور برہمنیت (Preist hood) کی رسوم پرستیاں تھیں۔ حضورؐ نے ان اطواق و سلاسل کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا لیکن مسلمانوں نے ان بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے فرطِ عقیدت سے اکٹھا کیا اور اپنے احبار و رہبان کے مقدس ہاتھوں پھر . . اپنی گردنوں میں ڈال لیا اور ان غیر فطری قیود کا نام دین قرار دے لیا۔ یہ "دین" بھلا زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ کس طرح دے سکتا تھا؟ لہٰذا جو مسلمان ان قیود سے تنگ آئے انہوں نے ان اطواق و سلاسل کو اس زور سے اتار کر پھینکا کہ ان کے ساتھ ہی حبل اللہ (اللہ کی رسی۔ قرآن) کا قلادہ بھی ان کی گردنوں سے نکل گیا۔ آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ جو قفس کی تیلیوں میں بند ہیں تو اس طرح کہ انہیں آزادی کی فضا میں ایک سانس تک لینا نصیب نہیں اور جو آزاد ہیں تو ایسے کہ فضا کی پہنائیوں میں اڑ رہے ہیں لیکن آشیانہ کہیں میسر نہیں۔

قرآن کہیں نہیں

یوں وہ فروعات و جزئیات جنہیں ابدی طور پر ناقابل تغیر رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا نہ مقصود رسالت، دین بن گئیں۔ چنانچہ یہ سلسلہ اس وقت تک چلا آ رہا ہے۔ وہی فرقہ بندیاں، وہی گروہ سازیاں، وہی عملی برہمنیت (PRIEST HOOD) اور وہی ان کی اسلاف پرستی، وہی تقلید جامد اور وہی اس کے افسردہ نتائج۔ آپ کسی معاملہ کے متعلق اہل حدیث حضرات سے پوچھئے وہ کہدیں گے کہ بخاری میں یوں آیا ہے۔ مسلم کی روایت یہ ہے اور کسی اہل فقہ سے پوچھئے تو جواب ملے گا کہ المبسوط میں یہ لکھا ہے۔ اور شامی میں یوں آیا ہے۔ عالمگیری کا یہ فتویٰ ہے۔ فلاں امام کا یہ قول ہے۔ کوئی یہ نہیں کہیگا کہ قرآن نے یہ حکم دیا ہے۔ اس لئے کہ قرآن سب کے نزدیک ساقط العمل ہو چکا ہے اور اس لئے مہجور و محجوب۔ اس اشخاص پرستی سے تنگ آ کر آج سے کچھ عرصہ پہلے بعض لوگوں نے رجعت الی القرآن کی آواز بھی اٹھائی لیکن چونکہ یہ چیز ان کی نگاہوں سے بھی اوجھل تھی کہ قرآن نے جن جزئیات کو متعین نہیں کیا انہیں کس طرح سے متعین کیا جائے گا۔ اس لئے وہ اس اعتراض سے، گھبرا کر کہ اگر قرآن ہی دین کی تکمیل کے لئے کافی ہے تو اس میں سے فلاں فلاں بات کی تفصیل نکال کر دکھاؤ، لگے قرآن سے ان جزئیات کو بھی متعین کرنے

جن کے اس نے صرف اصول دیئے تھے۔ وہ اس کوششِ ناکام و ناصواب میں ایسے الجھے کہ ٹھکانے کی بات کچھ بھی نہ کر سکے اور خود ایک فرقہ (اہلِ قرآن) بن کر رہ گئے۔

اسے پھر سن لیجئے کہ

(۱) قرآن نے جن جزئیات کو خود متعین کر دیا ہے وہ قیامت تک کے لئے ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں (اور ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے)

(۲) باقی امور کے لئے اس نے اصول مقرر کئے ہیں جن کے اندر رہتے ہوئے، ہر زمانے کی حکومتِ اسلامی (یاد رکھئے افراد نہیں بلکہ **حکومت** جو قرآنی اصول مشاورت کی رو سے قائم کی جائے) اپنے زمانے کے مقتضیات کے مطابق، عقل کی روشنی میں ان کی جزئیات خود متعین کرے گی۔ اور یہی جزئیات اس زمانے کیلئے نظامِ شریعت قرار پائیں گی۔ ان جزئیات کی تعیین میں، ہر زمانے کی قرآنی حکومت، ان کوششوں کو بھی سامنے رکھے گی جو اس سے قبل مختلف ادوار کی اسلامی حکومتوں نے (اور مختلف افراد نے) اس باب میں کی ہیں۔ اس بنا پر مجموعۂ احادیث اور کتبِ فقہ سے بطور نظائر (PRECEDENTS) فائدہ اٹھایا جائیگا ان میں جو باتیں قرآنی اصولوں کے مطابق ہوں گی اور موجودہ زمانے کے تقاضے ان میں تغیر و تبدل کے متقاضی نہ ہوں گے وہ علیٰ حالہٖ رکھ لی جائیں گی۔ یا ان میں مناسب تغیر و تبدل کر کے از سرِ نو رائج کیا جائیگا۔ باقی خود متعین کی جائیں گی۔

کشتری اور برہمن

مذہب کو ایک پرائیوٹ حیثیت دے کر اسے احبار و رہبان (علما و مشائخ) کے ہاتھوں میں سونپ دینے کا جو سلسلہ، دینی لامرکزیت اور ملت کا شیرازہ بگڑنے کے زمانے سے شروع ہوا تھا وہ آج تک جاری ہے خود اپنے زمانے ہیں دیکھئے۔ دنیا میں متعدد "اسلامی سلطنتیں" موجود ہیں لیکن ہر جگہ دین اور دنیا کی ثنویت (DUALISM) کا نظام کارفرما ہے۔ حکومت بادشاہوں کے ہاتھ میں ہے اور مذہب علما کے تسلط میں، اور دونوں کا استبداد عوام کے اذہان و قلوب پر مسلط۔ چونکہ اربابِ ملوکیت اور عمائدِ مذہب کے مفاد مشترک ہیں اس لئے ان دونوں میں اس قسم کی ملی بھگت ہے جس طرح کشتری راجاؤں اور برہمنوں میں ہوتی تھی۔ راجہ، برہمنوں کی رکھشا (حفاظت) کرتے تھے اور برہمن، راجاؤں کو اشیرباد (سلامتی کی دعائیں) دیتے تھے اور دونوں مل کر عوام کو محکومیت کے آہنی پنجے میں جکڑے رکھتے تھے۔ یہی حالت ہمارے ہاں کی ملوکیت میں تھی۔ بادشاہ علماء کو قاضی اور مفتی بنا دیتے تھے اور علماء بادشاہوں کو ظلِ اللہ بنا کر خطبوں میں ان کے نام صلوٰۃ و سلام کے ساتھ لیتے تھے اور عوام بیچارے ان دونوں کے تغلب و استبداد کے نیچے کچلے جاتے تھے۔ یہی سلسلہ اب تک جاری ہے۔ غضب خدا کا۔ آج دنیا میں شخصی حکومتیں کہیں باقی نہیں رہیں بجز مسلمانوں کی حکومتوں کے۔ جس طرح بردہ فروشی کہیں باقی نہیں بجز مکہ کی گلیوں کے۔ غور کیجئے یہی علما ایک طرف ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ جرمِ عظیم جسکی وجہ سے یزید مستحقِ لعنت سمجھا جاتا ہے یہ ہے کہ اس نے سلطنت کو انتخاب کے ذریعے حاصل نہیں کیا بلکہ باپ سے وراثتاً پایا تھا اور اس طرح خلافت کو ملوکیت میں بدل دیا تھا[1]۔ لیکن

---

[1] احادیث میں یزید کے متعلق بھی عجیب چیز ملتی ہے۔ بخاری کی حدیث ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کریگا بخشا ہوا ہے (مغفور لہم) اور طبری کا بیان ہے کہ جس پہلے لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا ہے اس کے ایک دستے کا سپہ سالار خود یزید تھا۔

اے عقل چہ می گوئی؟ اے عشق چہ فرمائی؟

ملوکیت اور ملائیت

دوسری طرف حالت یہ ہے کہ بنی امیہ سے لیکر آج تک ان تمام بادشاہوں کی جنھوں نے سلطنت کو یزیدی کی طرح وراثتاً حاصل کیا تھا اور آج بھی جو اسی طرح تخت و تاج کے مالک بنے بیٹھے ہیں، علماء کی طرف سے تائید و محافظت حاصل رہی ہے۔ (اور آج بھی ہے) بادشاہ ان کی پرورش کرتے تھے اور یہ بادشاہوں کے تخت و تاج کی حفاظت کرتے تھے۔ اور آج تک یہی سلسلہ جاری ہے۔ قرآن کا نظام نہ وہ نافذ کرنا چاہتے ہیں نہ یہ۔ اسلئے کہ اس نظام میں نہ ملوکیت باقی رہ سکتی ہے نہ ملائیت (PRIEST HOOD) قرآن ان دونوں کا خاتمہ کر دیتا ہے اور خدا اور بندے کے درمیان کسی واسطہ کو باقی نہیں رہنے دیتا۔ اطاعت صرف ایک خدا کے قانون کی اور بس۔ اور اس کا ذریعہ، ملت کے منتخب کردہ بہترین افراد پر مشتمل مجلس شوریٰ اور ان میں کا منتخب کردہ بہترین فرد امام جو قرآن کے قانون کو دنیا میں نافذ کردے۔ یہ نظام جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ان حکومتوں میں نافذ نہیں ہو سکتا جن پر اس وقت مسلمان بادشاہوں کا تسلط ہے اور جن کی محافظت علماء کے اوراد و فتاویٰ سے ہو رہی ہے۔ اس نظام کے نفاذ کی ابتدا اگر کہیں ہو سکتی ہے تو وہ سرزمین پاکستان ہی ہے اس لئے کہ اس پر ابھی شخصی ملوکیت کا تغلب نہیں ہوا۔ اس میں جس انداز کی حکومت ہم چاہیں رائج کر سکتے ہیں۔ لہٰذا پاکستان کا خطۂ ارض ایک تجربہ گاہ ہے جس میں قرآن کا وہی نظام جو سب سے پہلے محمد رسول اللہ والذین معہ (علیہم التحیۃ والسلام) کے مقدس ہاتھوں سے سرزمینِ حجاز میں نافذ ہوا تھا بار دگر رائج ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہاں دستور سازی کا کام ان لوگوں کے سپرد ہو گیا جو ان جزئیات کو ناقابلِ تغیر و تبدل سمجھتے ہیں جو کہیں ہزار برس پہلے، اس زمانے کی تمدنی ضروریات کے پیش نظر وضع کی گئی تھیں (یعنی ہمارے علماء کرام) ... تو یہاں بھی دو صورتوں میں سے ایک صورت ناگزیر ہو گی۔ یعنی

(۱) جو نظام یہ حضرات پیش کریں گے وہ ناممکن العمل بھی ہو گا اور بیحد متنازعہ فیہ[1] بھی، اس لئے قوم سرے سے دینی نظام ہی سے اظہار برأت کر دیگی اور ترکوں کی طرح حکومت کی بنیاد خالص دنیاوی قوانین پر رکھ لے گی اور یا

(۲) وہ پارٹی جس کے ہاتھ میں زمام اقتدار و حکومت ہو گی، ان سے مصالحت کر کے مذہب ان کے سپرد کر دے گی اور ان کی عباؤں اور قباؤں کے سائے میں اپنی من مانی حکومت چلائے گی۔ اس طرح علماء کی سیادت بھی قائم رہے گی اور ارباب قوت کی قیادت بھی۔ لیکن دین کا قیام نہ اس صورت میں ہو سکے گا نہ اُس صورت میں۔

اب آپ نے اندازہ فرما لیا ہو گا کہ میں نے جب یہ بحث چھیڑی تھی کہ فقہ یا روایات قیامت تک کیلئے ابدی دین نہیں بن سکتیں تو وہ محض نظری مباحثہ نہ تھا بلکہ ایک خالص عملی نتیجہ کی طرف دعوت دینے کی تحریک تھی۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ارباب فکر و نظر سوچیں کہ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ جو غلط نظام، دین کے نام سے، مسلمانوں پر اتنی صدیوں سے مسلط چلا آ رہا ہے اور جس نے ان کی حالت یہ کر دی ہے کہ

---

[1] متنازعہ فیہ کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ علماء کا تمام گروہ اس ہزار برس میں اتنی سی بات کا فیصلہ نہیں کر سکا کہ نماز میں ہاتھ کھلے چھوڑنے چاہئیں یا باندھنے اور اگر باندھنے چاہئیں تو کس جگہ۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ کوئی متفقہ علیہ ضابطۂ آئین تیار کر دیں گے اپنے آپ کو فریب دینا ہے۔ پورا نظام تو ایک طرف یہ تو کسی ایک مسئلہ کا بھی متفق علیہ جواب نہیں دے سکتے۔ شیعہ کا جواب اور، سنی کا اور، مقلد کا اور، غیر مقلد کا اور، ان کے ہاتھ میں نظام شریعت کی تدوین کا کام دیکر قوم مصیبت میں پھنس جائے گی۔

بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

قرآنی نظام

وہی نظام اب آزاد پاکستان میں ان پر مسلط کر دیا جائے۔ یا وہ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ نے جب انھیں یہ آزاد خطۂ زمین موہبت فرمایا ہے تو اس میں پھر سے اس قرآنی نظام کو رائج کیا جائے جسے چشم فلک نے ایک مرتبہ دیکھا اور دوبارہ دیکھنے کے لئے وہ آج تک سرگرداں ہے۔ اس نظام قرآنی کی تشکیل و ترویج کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کی تعلیم بڑی واضح، بین اور تضاد و تعارض سے پاک ہے۔ وہ عقل انسانی کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور ہر زمانے کے انسانوں کو آزادی عطا کرتا ہے کہ وہ اس کے مقرر کردہ اصولوں کی روشنی میں اپنے فہم و تدبر سے اپنے لئے آپ قانونی جزئیات مرتب کریں۔ اس سے زیادہ آسان اور عقل انسانی کے عین مطابق اور کونسا نظام ہوگا! کہ

نہ جس میں عصرِ رواں کی حیا سے بیزاری — نہ جس میں عہدِ کہن کے فسانہ و افسوں
حقائقِ ابدی پر مدار ہے جس کا — وہ زندگی ہے نہیں ہے طلسم افلاطوں
طلوع ہے صفتِ آفتاب جس کا غروب — یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا ذوقِ جمال
عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

مخالفت

میں جانتا ہوں کہ اس دعوت کی مخالفت ہوگی۔ اس لئے نہیں کہ اس میں کوئی ایسی بات ہے جو دین کے خلاف ہو بلکہ اس لئے کہ اس سے ہمارے "اربابِ شریعت" کو اپنی عظمت و عقیدت کی مسندیں ہل جانے کا خوف ہے۔ ان میں بیشتر ایسے ہیں جو نظام شرعی کی تنفیذ و ترویج کا مطالبہ ہی اس لئے کر رہے ہیں کہ اختیار و اقتدار ان کے ہاتھ میں رہے۔ لیکن وہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لئے یہ کہہ کر اس دعوت کی مخالفت کریں گے کہ لیجئے! یہ ایسا نظام وضع کرنا چاہتے ہیں جس میں رسول اللہ کی حدیثوں ہی سے انکار ہو رہا ہے[1]۔ حالانکہ اس نظام میں حدیثوں سے انکار نہیں بلکہ انھیں ان کے اس مقام پر رکھنا ہے جو مقام خود منشائے رسالتؐ تھا۔ رسول اللہؐ کا یہ منشا کبھی نہ تھا کہ حضورؐ کے ہنگامی اور وقتی فیصلے قیامت تک کے لئے ناقابل تغیر سمجھ لئے جائیں۔

روایات

اگر حضورؐ کا یہ منشا ہوتا تو جس طرح آپ قرآن کو لکھوا کر بحفاظت ملت کے سپرد کر گئے تھے اپنی متعین فرمودہ جزئیات کا مجموعہ بھی اسی طرح لکھوا کر بحفاظت ملت کو دے جاتے۔ لیکن رسول اللہؐ اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ امت کو دے کر نہیں گئے ان روایات کو لوگوں نے اپنے طور پر جمع کیا اور وہ بھی حضورؐ کی وفات کے سینکڑوں برس بعد۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ حدیثوں کے جو مجموعے ہمارے پاس موجود ہیں ان میں سے کسی حدیث کے متعلق بھی کوئی شخص قطعی اور حتمی طور پر یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ فی الواقعہ

---

[1] یہ مضمون جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس قرآنی تصورِ حکومت کی جس قدر مخالفت مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ہوئی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

رسول اللہؐ ہی کا ارشاد ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، احادیث کا صحیح ترین مجموعہ بخاری کو سمجھا جاتا ہے۔ یہ احادیث امام بخاریؒ نے رسول اللہؐ سے ڈھائی سو سال بعد لوگوں کی زبانی سن کر جمع کیں۔ ڈھائی سو سال کے عرصہ میں سنی سنائی باتیں جس قدر قابل اعتماد رہ سکتی ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ حالانکہ صورت یہ تھی کہ حضورؐ کے بہت بعد نہیں بلکہ خود صحابہؓ کے سامنے ایسی احادیث آجاتی تھیں جنھیں وہ دیکھتے تھے کہ قرآن کے خلاف ہیں اس لئے وہ انھیں رد کر دیتے تھے۔ مثلاً فاطمہ بنت قیس کی روایت کہ طلاق بائنہ پائی ہوئی عورت کے لئے شوہر کے ذمہ نہ مکان ہے نہ نفقہ۔ جب حضرت عمرؓ کے سامنے آئی تو آپ نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ قرآن کے خلاف ایک عورت کی بات کیسے مان لی جائے۔ حضرت ابن عمرؓ نے جب بدر والی حدیث بیان کی کہ مردے سنتے ہیں تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ اللہ ابن عمرؓ پر رحم کرے۔ قرآن میں صاف لکھا ہے کہ مردے نہیں سن سکتے۔ اسی طرح جب آپ کے سامنے یہ حدیث بیان کی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا تھا کہ مردہ پر اس کے گھر والوں کے نوحہ کرنے سے عذاب ہوتا ہے تو آپ نے کہا کہ یہ حدیث غلط ہے کیونکہ قرآن میں ہے کہ ایک کا گناہ دوسرا نہیں اٹھائے گا۔ سو جب خود صحابہؓ کے زمانے میں اس قسم کی احادیث مروج ہو گئی تھیں تو اڑھائی سو سال کے عرصہ میں ان کی جو کیفیت ہو گئی ہو گی وہ ظاہر ہے۔ بالخصوص جب اس حقیقت کو بھی سامنے رکھا جائے کہ نادانستہ نہیں بلکہ خاص مقاصد کے ماتحت جھوٹی حدیثیں اس کثرت سے وضع کی جایا کرتی تھیں کہ پناہ بخدا۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ عبدالکریم ابن ابی العوجاء کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا تو اس نے کہا کہ میں نے چار ہزار احادیث جن میں حرام اور حلال کے احکام ہیں وضع کر کے لوگوں میں پھیلا دی ہیں۔ یہ صرف ایک مثال ہے۔ اس قسم کے ہزاروں واضعین احادیث اس عرصہ میں پیدا ہو چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے صحیح ترین مجموعوں میں بھی ایسی حدیثیں ملتی ہیں جن پر دین ہنستا ہے اور عقل روتی ہے۔ کہیں ان میں ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے پاس جب ملک الموت آیا تو آپ نے اس کے ایسا تھپڑ مارا جس سے اس کی آنکھ باہر نکل پڑی۔ یا حضرت موسیٰؑ اپنے کپڑے ایک پتھر پر رکھ کر نہا رہے تھے کہ پتھر کپڑے لیکر بھاگ اٹھا اور آپ اس کے پیچھے ننگے بھاگ کھڑے ہوئے۔ یا یہ کہ حضرت سلیمانؑ نے ایک رات میں نوّے بیویوں سے مقاربت کی۔ یا یہ کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا۔ اور کہیں اس قسم کی احادیث کہ جس سے خود شانِ نبوت پر حرف آجائے۔ مثلاً یہ کہ آپؐ پر کسی نے جادو کر دیا تھا جس سے آپ کو نسیان ہو گیا تھا۔ یا حضورؐ نے پیٹ کی بیماری میں اونٹوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا اور قتل کے جرم میں ہاتھ پاؤں کاٹ کر ان کی آنکھوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالا اور وہ پیاس سے تڑپ رہے تھے لیکن انھیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔ یا اس قسم کے اساطیر کہن (MYTHOLOGY) کی باتیں کہ حضرت آدمؑ کا قد ساٹھ گز کا تھا۔ جبرئیل و میکائیل جنگ بدر میں سفید کپڑے پہنے ہوئے حضورؐ کی طرف سے لڑتے تھے۔ شیطان، حضرت ابوہریرہؓ کی محافظت میں رکھے ہوئے مال کو چرانے آتا تھا اور آپ اس کی بہانہ سازیوں پر یقین کر کے اسے چھوڑ دیتے تھے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں بیل اور بھیڑیا انسانوں کی طرح باتیں کیا کرتے تھے۔ مرغ جب بولتا ہے تو فرشتے کو دیکھتا ہے اور گدھا بولتا ہے تو شیطان کو دیکھتا ہے۔ یا حضرت ابن عمرؓ کے پاس ریشم کا ایک ٹکڑا تھا، آپ جہاں جنت میں پہنچنے کا ارادہ کرتے وہ اڑا کر پہنچا دیا کرتا تھا۔ یا رسول اللہؐ کو ایک درخت نے بتایا کہ جنات آپ سے قرآن سن کر گئے ہیں۔ سب حدیثیں بخاری شریف میں موجود ہیں۔ اور یہ تو یونہی چند مثالیں ہیں۔ حدیثوں کے تمام مجموعے اس قسم کی حدیثوں سے بھرے پڑے ہیں۔

وضعِ احادیث

حدیثوں کے اس قدر ظنی ہونے کی وجہ سے ہی امام ابوحنیفہؒ ان احادیث کو بھی مسترد کر دیا کرتے تھے جو قیاس صحیح کے خلاف ہوں۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ حضورؐ جب سفر میں جاتے تو قرعہ ڈالتے اور ازواج مطہرات میں جس کے نام قرعہ نکلتا انھیں ساتھ لے جاتے۔ امام اعظمؒ نے یہ کہہ کر اس سے انکار کر دیا کہ قرعہ اندازی تو اصولاً قمار بازی ہے اس لئے اس حدیث کو کیسے صحیح مان لیا جائے۔ یا مثلاً جب کسی نے کہا کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب تک بائع اور مشتری جدا نہ ہوں انھیں بیع کے فسخ کرنے کا حق رہتا ہے۔ امام اعظمؒ نے یہ کہہ کر اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اگر یہ دونوں ایک ہی قید خانہ میں ہوں یا ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے ہوں تو اس صورت میں بیع پختہ ہی نہیں ہو سکے گی۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

وقت کے تقاضوں کی بنا پر احکام میں اجتہاد کی تو ایسی صورتیں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ اس باب میں صحابہؓ نے دین کی اس علم کو کس قدر صاف طور پر سمجھا تھا۔ قرآن میں چوری کی سزا قطع ید ہے لیکن اس کا تعین نہیں کہ چور کسے کہا جائے گا۔ ایک مرتبہ قحط پڑا اور کچھ لوگوں نے بھوک سے مجبور ہو کر چوری کر لی۔ حضرت عمرؓ نے انھیں قطع ید (ہاتھ کاٹ دینے) کی سزا نہیں دی۔

میں نے ان مثالوں کو اس لئے بیان کیا ہے کہ یہ واضح ہو جائے کہ نظام اسلامی کی تدوین کیلئے جس مسلک کی طرف میں نے دعوت دی ہے اس میں احادیث کو ان کے اصلی مقام پر رکھا جائے گا۔ اسلئے اس باب میں غلط پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر راہ حق و صداقت کو چھوڑ نہیں دینا چاہئے۔

پس چہ باید کرد

ان تصریحات کے پیشِ نظر کرنے کا کام یہ ہے کہ مجلس دستور ساز ملت کے منتخب ارباب فکر و نظر کی ایک ایسی کمیٹی متعین کرے جس میں ماہرین قوانین و دساتیر عالم اور وہ حضرات شامل ہوں جو قرآن و تاریخ دین پر غائر نگاہ رکھتے ہوں۔ ماہرین قوانین یہ تجویز کریں کہ پاکستان کی حکومت کے لئے کون کون سی شقوں پر مشتمل ضابطۂ قانون کی ضرورت ہے۔ پھر قرآن اور تاریخ دین جاننے والے حضرات اس خاکہ کو سامنے رکھ کر غور کریں کہ

(۱) ان میں کون کون سی باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق قرآن نے فروعات و جزئیات تک متعین کر دی ہیں۔ اور

(۲) کون کون سی ایسی ہیں جن کے متعلق صرف اصولی حکم دیا ہے۔

شق ثانی کے متعلق وہ غور کریں کہ اس قسم کے مسائل اس سے پیشتر نبی اکرمؐ کے زمانے سے لیکر بعد تک کبھی سامنے آئے ہیں۔ اور اگر آئے ہیں تو ان کے متعلق کیا روش اختیار کی گئی۔ پھر یہ دیکھا جائے کہ وہ روش کیا آج بھی نافذ العمل ہو سکتی ہے یا موجودہ زمانے کے مقتضیات اس میں تغیر و تبدل چاہتے ہیں۔ اگر اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہ ہو تو اسے علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے ورنہ اس میں حسب اقتضایات زمانہ مناسب رد و بدل کر دیا جائے۔ اس رد و بدل میں یہ اصل ہر وقت پیش نظر رہے کہ کوئی فرع، قرآن کی اصل سے کہیں متعارض نہ ہو۔ یہ مجموعۂ قوانین، ملت اسلامیہ پاکستانیہ کا ضابطۂ نظام شریعت ہوگا اور اس میں مزید ضروریات کے ماتحت مناسب حال تغیر و تبدل ہوتا رہے گا۔ یہ فریضہ تمام ملت کا مشترکہ ہے جسے ملت اپنے منتخب کردہ حضرات کے سپرد کرے گی۔ اس میں کسی خاص جماعت کی اجارہ داری نہیں ہوگی۔ قوانین شریعت یا ان کی تعبیر و تفسیر افراد کے ذمے نہیں رکھی جائے گی اس لئے پرائیویٹ تمام کی

ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ قوانین کی ترتیب و تدوین بھی اصولِ جمہوری کے ماتحت، ملت کا مشترکہ فریضہ ہوگا اور ان کی تنفیذ و ترویج یا تعبیر و تفسیر (INTERPRETATION) بھی ملت کی قائم کردہ حکومت ہی کے ذمے ہوگا۔ وہیں کا فیصلہ فتویٰ کہلائے گا۔

مجھے تسلیم ہے کہ یہ تجربہ چونکہ ایک مدت کے بعد دہرایا جا رہا ہے اس لئے شروع شروع میں جو قانون بنے گا اس میں شاید خامیاں رہ جائیں۔ لیکن ان خامیوں سے گھبرانا نہیں چاہئے ہمارا یہ قدم صحیح راستے پر ہوگا اور آہستہ آہستہ تجربے کے بعد، یہ خامیاں بھی رفع ہوتی جائیں گی۔ اور پھر ایک دن ہم ساری دنیا کو یہ کہنے کے قابل ہو جائیں گے کہ یہ ہے وہ نظامِ زندگی جسے خالقِ کائنات نے انسانیت کی نشوونما کے لئے متعین فرمایا تھا اور جو ارتقائے شرفِ انسانیت کے لئے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ وہ دن ہوگا جب زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھے گی "واشرقت الارض بنور ربھا"۔ اور ہر دیکھنے والا پکار اٹھے گا کہ

برخیز کہ آدم را، ہنگام نمود آمد ایں مشتِ غبارے را، انجم بہ سجود آمد

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے۔ میں نے اس مضمون میں "اسلامی نظام" کی افادیت، ہمہ گیریت، فوقیت اور افضلیت سے بحث نہیں کی۔ اس لئے کہ یہ پہلو موضوعِ پیشِ نظر سے خارج ہے۔ اس وقت مجھے صرف اتنا بتانا ہے کہ اسلامی نظام شریعت سے مفہوم کیا ہے اور اس کی ترتیب و تشکیل کس طرح عمل میں آئے گی۔ باقی رہا یہ کہ یہ نظام کیا نتائج پیدا کرے گا اور وہ نتائج کس طرح مترتب ہوں گے۔ یہ ایک جداگانہ بحث ہے جسے ہم کسی دوسرے وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ ایک نکتہ واضح طور پر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ اور وہ یہ کہ

عقلِ انسانی کا مقام

اس نظام میں کس طرح انسانی عقل کو اس کا صحیح مقام عطا کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر صرف اس ایک جہت سے ہی دیکھا جائے تو بھی اسلامی نظام کی عظمت نمایاں طور پر سامنے آ جاتی ہے۔ جب سے شعورِ انسانی نے آنکھ کھولی ہے "مذہب اور عقل کی کشمکش" ہمیشہ اس کے سامنے رہی ہے۔ دنیائے مذہب نے ہر بار یہی پکارا کہ اس میں عقل کو کوئی دخل نہیں۔ اس کی حدیں ماورائے سرحدِ ادراک سے شروع ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس عقل کو ہمیشہ یہی دعویٰ رہا کہ انسانی زندگی کے فیصلوں کا حق صرف اسی کو حاصل ہے۔ وہ اپنے اس حق میں کسی اور کی شرکت گوارا نہیں کر سکتی اور نہ ہی اس پر کسی قسم کی پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔ انسانیت کی تاریخ میں قرآن ایک ایسا سنگِ میل ہے جہاں سے فی الواقعہ ایک نئے انداز زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس نے عقل اور مذہب کے صحیح حدود متعین کر کے ان میں اس قسم کی یک جہتی اور ہم نگہی پیدا کی ہے کہ وہ دو متضاد و متخاصم عناصر ہونے کے بجائے ایک دوسرے کے معاون و رفیق بن گئے ہیں۔ قرآن کے اوراق کو الٹتے جائیے شروع سے اخیر تک آپ دیکھیں گے کہ وہ عقل و بصیرت فہم و فراست، علم و دانش، تدبر و تفکر کو کس طرح وجۂ شرف و تکریم قرار دیتا ہے۔ وہ مخاطب ہی عقل کو کرتا ہے۔ اس کے نزدیک صاحبانِ دانش و بینش اولی الابصار و اولی الالباب ہی وہ لوگ ہیں جو اس کے پیغام کو سمجھنے اور اسے بروئے کار لانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس، عقل و فکر سے کام نہ لینے والوں کو وہ "بدترین خلائق" قرار دیتا ہے۔ ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون ۔ (یقیناً اللہ کے نزدیک بدترین خلائق وہ لوگ ہیں جو بہرے اور گونگے بنے رہتے ہیں اور عقل سے کچھ کام نہیں لیتے)

اس کے نزدیک ایسے انسان اس قابل ہی نہیں کہ انہیں انسانوں کے زمرہ میں شامل کیا جائے۔

ولقد ذرأنا لجهنم كثيرا من الجن والانس لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم اذان لا يسمعون بها اولئك كالانعام بل هم اضل اولئك هم الغافلون ۰ (۷/۱۷۹)

کتنے ہی جن وانس ہیں جنہیں ہم نے جہنم کیلئے پیدا کیا ہے (یعنی ان کے اعمال کے بدلے ان کا ٹھکانہ جہنم ہونے والا ہے) یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کے پاس قلب ودماغ ہے لیکن وہ اس سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ عقل ودانش کو الگ رکھ کر حیوانوں کی طرح ہوگئے۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے، یہ وہ لوگ ہیں جو (دنیا وما فیہا سے) بے خبر زندگی بسر کرتے ہیں۔

لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتاتا ہے کہ چونکہ عقل کا فطری منصب تحفظ ذات (PRESERVATION OF SELF) ہے۔ یعنی اس کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس فرد کی طبیعی زندگی کو محفوظ رکھے جس کی وہ پاسبان ہے۔ اسلئے جسوقت مختلف افراد کے مفاد آپس میں ٹکرائیں گے۔ (اور ایسا تصادم، اجتماعی زندگی میں قدم قدم پر ہوتا ہے) اس وقت ان افراد کی عقول کی باہمی جنگ لازمی ہے۔ اسی کو (BATTLE OF WITS) کہتے ہیں۔ یعنی عقل انسانی، صرف افراد کے حقوق کا تحفظ چاہتی ہے۔ انسانیت کے مفاد کلی کا تحفظ اس کے حیطۂ فرائض سے باہر ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ افراد کی عقل کو ایسی حدود کے اندر رکھا جائے جس سے وہ انسانیت کے مفاد کلی کے لئے ضرر رساں نہ ہوسکے۔ ان ہی حدود کا نام وہ اصولی قوانین ہیں جو قرآن نے انسانی زندگی کی راہنمائی کے لئے متعین کئے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے عقل انسانی کو پوری آزادی حاصل ہے کہ وہ تسخیر کائنات میں اپنی تمام قوتیں صرف کردے۔ یہ ہے "عقل اور مذہب" میں وہ تطبیق وموافقت جسے قرآن نے پیدا کیا ہے۔ اس کے نزدیک عقل آنکھ ہے اور قرآنی اصول، سورج کی روشنی۔ نہ آنکھ روشنی کے بغیر اپنا فریضہ سرانجام دے سکتی ہے اور نہ روشنی آنکھ کے بغیر کسی مصرف کی ہے۔ عقل کو الگ کرکے انسانوں کی دنیا پتھروں کا ڈھیر بن جائیگی لیکن عقل کو چھوڑ کر، یہ دنیا درندوں کے بھٹ میں تبدیل ہوجائے گی۔ عقل وفکر سے کام نہ لینے والے، قرآن کے نزدیک انسانی زندگی کی سطح سے بہت نیچے ہیں۔ لیکن عقل سرکش اور علم بیباک کا نام اس کی زبان میں ابلیسیت اور شیطانیت[1] ہے۔ عقل، جب ان ابدی اصولوں کی رفاقت میں کام کرتی ہے جنہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے تو اس سے یہ دنیا اس جنت میں تبدیل ہوجاتی ہے جس کی تلاش میں آدم اتنے عرصہ سے مارا مارا پھر رہا ہے۔ اسلامی نظام عقل اور ابدی اصولوں میں یہی رفاقت وتعاون پیدا کرتا ہے۔ ملائیت (PRIESTHOOD) کی افیون عقل کو سلب کرتی ہے اور ملوکیت کا استبداد، ان ابدی اصولوں کی جگہ، انسان کے خود ساختہ قوانین کی اطاعت کراتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں انسانی زندگی کے خلاف اور احترام آدمیت کی نقیض ہیں۔ ان کے برعکس اسلامی نظام حکومت عقل کو اجاگر کرتا ہے اور اسے اس نور مبین (کھلی کھلی روشنی) میں چلاتا ہے جو اس کی راہنمائی کے لئے قرآنی آفتاب کی کرنوں سے پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں کے امتزاج بلکہ رفاقت سے شرف انسانیت بلند سے بلند تر ہوتا ہوا زمین کی پستیوں سے آسمان کی رفعتوں کی

---

[1] ان امور کی تفصیل معارف القرآن کی جلد دوم میں ملے گی۔

طرف ابھرتا چلا جاتا ہے۔ یہ ہیں اسلامی نظام کے صحیح نتائج۔

لیکن اس حقیقت کو بھی یاد رکھئے کہ کوئی نظام اپنے صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتا جب تک اسے چلانے والے اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کر لیں۔ باہر کی دنیا کا انقلاب، اندر کی دنیا کے انقلاب کا عکس ہوا کرتا ہے۔ قرآنی نظام میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ دل کی دنیا میں تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے۔ اور پھر یہی تبدیلیاں اس نظام کو بطریق احسن چلائے جاتی ہیں اس طرح ایک ایسا دائرہ (CYCLIC ORDER) قائم ہو جاتا ہے جو خود اپنے زور (MOMENTUM) سے متحرک رہتا ہے۔ یہ تبدیلیاں کس طرح پیدا ہوتی ہیں اور اس نظام میں فرد اور جماعت کا کیا تعلق ہوتا ہے یہ چیزیں کسی دوسرے وقت عرض کروں گا[1]۔ اس وقت صرف اتنا دیکھئے کہ جس اسلامی نظام کے لئے چاروں طرف سے پکار ہو رہی ہے وہ ہے کیا اور آج اسے مرتب کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہی چیز ہے جسے میں نے گذشتہ صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

بعض مقامات کی مزید وضاحت

[مندرجہ صدر مضمون جولائی ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے اگست ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں اپنے مخصوص سلسلۂ مقالات "سلیم کے نام خطوط" کے ضمن میں اس مضمون کے بعض اہم مقامات کی مزید توضیح فرمائی وہو ہذا۔ طلوع اسلام]

تمہارا خط ملا۔ سچ پوچھو تو میں اس خط کا اُس دن سے انتظار کر رہا تھا جس دن تمہیں طلوع اسلام کا وہ پرچہ بھیجا ہے جس میں "اسلامی نظام" سے متعلق میرا مضمون شائع ہوا تھا۔ اس لئے تم نے جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے وہ غیر متوقع نہیں اور نہ ہی وہ ذہنی انتشار اور فکری الجھاؤ جو ان شبہات کا محرک ہوا ہے۔ سلیم! تم ابھی نہیں جانتے کہ جو عقیدہ کسی قوم میں صدیوں سے متوارث چلا آ رہا ہو اور توارث اور ماحول کے موثرات سے انسانی تحت الشعور (SUB-CONSCIOUS MIND) کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو چکا ہو وہ کس طرح مبنی علی الحقیقت نظر آتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے اس قسم کے عقیدہ کی تائید میں دلائل و براہین بھی رکھتا ہو۔ لیکن یہ دلائل و براہین ذہن انسانی کے بعد کے تراشیدہ ہوتے ہیں۔ اس نے اس عقیدہ کو ان دلائل و براہین کی بنا پر اختیار نہیں کیا ہوتا۔ عقل کا منصب تحفظِ ذات (PRESERVATION OF SELF) ہے اور شکستِ پندار خواہ وہ علمی اور نظری میدان ہی میں کیوں نہ ہو ضعفِ ذات کا موجب ہوتا ہے۔ اس لئے عقل، ہر اس عقیدہ کے لئے جو انسان نے غیر شعوری طور پر اختیار کر رکھا ہو دلائل و براہین وضع کرتی رہتی ہے تاکہ فریقِ مقابل سے شکست کھا کر انسان کی ذات میں احساس کمتری (INFERIORITY COMPLEX) نہ پیدا ہو جائے کہ احساسِ کمتری جذبۂ مرعوبیت کا موجب بنتا ہے اور جذبۂ مرعوبیت ضعفِ ذات کا سبب۔ اس لئے جب کبھی انسان کے سامنے کوئی

---

[1] اس ضمن میں "سلیم کے نام خطوط" کا سلسلہ دیکھئے جو طلوع اسلام میں شائع ہوتا چلا آ رہا ہے۔

ایسی بات آئے جس سے اس کے کسی عقیدہ کی تغلیط ہوتی ہو تو عقل کی طرف سے پہلا ردعمل، اس نئے نظریئے یا اصول کی تردید ہوتا ہے۔ غیر شعوری طور پر اختیار کردہ عقائد کو منزہ عن الخطا سمجھ کر ان کے گرد حصارِ عافیت کھینچنے کی کوشش کا نام تقلید اعمیٰ ہے جو صحیح علم و بصیرت کی بدترین دشمن اور ہر دعوت الی الحق اور حرکت انقلاب کی اولین مخالف ہوتی ہے۔ آسمانی سلسلۂ رشد و ہدایت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے ہر داعی الی اللہ کی دعوت حق و صداقت کے جواب میں یہی کیا گیا کہ جو عقائد ہمارے آباو اجداد سے متوارث چلے آرہے ہیں ہم انھیں چھوڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ (وکذالک ما ارسلنا من قبلک فی قریۃ من نذیر الا قال مترفوھا ان وجدنا اٰباءنا علیٰ امۃ وانا علیٰ اٰثارھم مقتدون۔ ۴۳/۲۳۔ اسی طرح، اے رسولِ عربی، ہم نے تجھ سے پہلے کسی بستی میں کوئی نذیر نہیں بھیجا مگر وہاں کے سہل انگار طبقہ نے یہ نہ کہا ہو کہ ہم نے اپنے آباو اجداد کو ایک مسلک پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے ہیں)۔ لیکن سلیم! ذرا سوچ کہ کسی عقیدے کے صحیح ہونے کا یہ معیار کس قدر غلط ہے کہ وہ اسلاف سے وراثتاً منتقل ہو کر آیا ہے۔ اگر تپ دق کے جراثیم جو انسان کو اپنے اجداد سے وراثتاً ملے ہوں یقیناً اس قابل ہیں کہ جس قدر جلد ہو سکے انھیں فنا کر دیا جائے تو غلط معتقدات کے جراثیم ایسے مقدس کیوں تصور کر لئے جائیں کہ ان کی پرورش خونِ قلب و جگر سے کی جائے۔ حق و باطل کے پرکھنے کا معیار وہ کسوٹی ہے جو اللہ کی طرف سے وحیٔ مبین کی شکل میں ہماری رشد و ہدایت کیلئے ہمیں عطا کی گئی ہے لہٰذا میں نے جو کچھ کہا ہے اسے اس ازلی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھو اور پھر نتیجہ پر پہنچو۔ یہ کہدینے سے کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ اس عقیدہ کے خلاف ہے جو جمہور کو اسلاف سے ملا ہے نہ جمہور کے اس موروثی عقیدہ کو صحیح قرار دیا جا سکتا ہے نہ میرے معروضات کا ابطال کر سکتا ہے۔ صحت و سقم کا معیار میزانِ قرآنی ہے، نہ میرا دعویٰ نہ غیر کی تردید۔ اس لئے اگر کوئی میری گذارشات کو باطل ٹھہراتا ہے تو اسے کہو کہ اس کیلئے قرآن کی بارگاہ سے سند لائے۔ قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین۔

سلیم! بات بالکل سیدھی اور صاف ہے۔ بڑھانے کو جتنی چاہے بڑھائے جائیے لیکن سمجھنے کے لئے بالکل واضح اور سادہ۔

ہم عشق کے ماروں کا، اتنا سا فسانہ ہے ۔۔۔ سمٹے تو مرا دل ہے پھیلے تو زمانہ ہے

تم تھوڑی دیر کے لئے یوں کرو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے اسے بھی بھول جاؤ اور جو عقیدہ ہمیں وراثتاً ملا ہے اسے بھی الگ رکھ دو (ثم تتفکروا) پھر از خود غور کرو کہ قرآن تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں زنا کی سزا متعین ہے لیکن شراب کی سزا کا کہیں ذکر نہیں۔ اب اس سے یا تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ قرآن، شراب خواری کو جرم ہی قرار نہیں دیتا اس لئے اس کی سزا تجویز نہیں کی گئی لیکن یہ نتیجہ خود قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے اس لئے کہ

(۱) قرآن کی رو سے خمر (شراب) رجس من عمل الشیطان (۵/۹۰) ہے یعنی ناپاک فعل شیطانی۔

(۲) زنا کے متعلق اس کا ارشاد ہے کہ انہ کان فاحشۃ (۱۷/۳۲) وہ فحش کاری ہے۔

اور (۳) شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے۔ فانہ یامر بالفحشاء والمنکر (۲۴/۲۱)

اس لئے شراب بھی فواحش میں سے ہوئی (کیونکہ شیطان فواحش کا حکم دیتا ہے اور شراب (خمر) شیطانی عمل ہے۔ اس لئے جس طرح زنا

فواحش میں سے ہے، فلہذا جرم، اسی لئے شراب فواحش میں سے ہے، فلہذا جرم۔ اس لئے یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ منشائے قرآنی یہ ہے کہ شراب (خمر) کی کوئی سزا نہ ہو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب شراب (خمر) کی سزا ضروری ہے تو قرآن نے اس کی سزا متعین کیوں نہیں کی جس طرح زنا کی سزا متعین کر دی ہے۔

ایک غیر مسلم معترض کہہ سکتا ہے کہ قرآن (معاذ اللہ) ناقص کتاب ہے۔ وہ کسی جرم کی سزا متعین کر دیتا ہے کسی کو غیر متعین چھوڑ دیتا ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ جن جرائم کی تعزیر (یعنی اجمال کی تفصیل) قرآن نے متعین نہیں کی، ان کی تعیین رسول اللہؐ نے کر دی ہے اور اس طرح کتاب اللہ کی تکمیل ہوئی ہے اس کا نام سنت قرار دیا جاتا ہے[1] اور دین سے مفہوم ہوتا ہے قرآن اور سنت۔

لیکن ذرا سوچو سلیم! کیا اس سے اس اعتراض کا واقعی جواب مل جاتا ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے! اعتراض یہ تھا کہ کیا خدا خود ان چیزوں کی تعیین نہیں کر سکتا تھا جو اُسے انھیں اس طرح غیر متعین چھوڑ کر دوسروں سے تکمیل کرانی پڑی؟ اسے کونسا امر مانع تھا کہ جس طرح زنا کی سزا متعین کر دی تھی اسی طرح شراب (خمر) کی بھی تجویز کر دیتا۔ یا جس طرح روزوں کے مہینے اور اوقات کی تخصیص کر دی تھی زکوٰۃ کی شرح بھی مقرر کر دیتا۔ مقام رسالت کی اس عظمت و رفعت کے باوجود جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ ـــــ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر ـــــ ذاتِ خداوندی کے متعلق یہ اعتراض اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے کہ اس نے ان تفاصیل و جزئیات کی خود تکمیل کیوں نہیں کی؟ یہ اعتراض ایسا قوی تھا کہ اس کے لئے ایک آفاقی سہارا ڈھونڈھنا پڑا۔ یعنی یہ عقیدہ وضع کرنا پڑا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کے مجموعہ کا نام قرآن ہے (اسے وحیٔ متلو کہتے ہیں، یعنی وہ وحی جس کی تلاوت کی جاتی ہے) اور دوسری وحی وہ جو قرآن سے باہر، رسول اللہؐ کی روایت میں ہے (اسے وحی غیر متلو کہتے ہیں کیونکہ اس کی تلاوت نہیں کی جاتی)۔ اس عقیدہ سے اس اعتراض کا جواب یوں مل گیا کہ ان جزئیات کی تعیین بھی خود خدا ہی نے کر دی ہے۔ البتہ وہ اصل کتاب (قرآن) میں نہیں بلکہ روایات کے مجموعوں میں ہے۔

ذرا سوچو سلیم! کہ یہ دلیل (یا عقیدہ) کس طرح بداہتاً غلط اور درایتاً کمزور ہے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ وحی کی اس تقسیم کی کوئی سند قرآن سے نہیں ملتی۔ وہاں واضح طور پر موجود ہے کہ وحی وہی ہے جو قرآن میں ہے اور جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ مثلاً سورۂ کہف میں ہے:ـــ واتل ما اوحی الیک من کتاب ربک۔ لا مبدل لکلماتہ ولن تجد من دونہ ملتحدا۔ (۱۸/۲۷) "تیرے رب کی کتاب جو تیری طرف وحی کی گئی ہے اس کی تلاوت کر۔ کوئی اس کے لفظوں کو بدل نہیں سکتا۔ (اور اگر تو بھی بفرضِ محال ایسا کرے تو) اس کے سوا تو کہیں پناہ نہ پائے گا۔" سارے قرآن میں اس کا اشارہ تک موجود نہیں کہ خارج از قرآن وحی کہیں اور بھی ہے یا وحی کی کوئی دوسری قسم بھی ہے۔ البتہ یہودیوں کے ہاں یہ عقیدہ تھا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں (متلو اور غیر متلو) اور وہیں سے یہ عقیدہ مسلمانوں نے مستعار لیا۔ (اس کی تفصیل تم نے معراج انسانیت کے باب ظہر الفساد میں دیکھ لی ہوگی)۔

---

[1] چونکہ شراب کی سزا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تجویز نہیں فرمائی بلکہ بعد میں حضرت عمرؓ نے متعین کی ہے اسلئے سنت کا مفہوم اور بھی وسیع کر دیا جاتا ہے جس میں نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے کے اقوال و اعمال سب شامل کر لئے جاتے ہیں۔

پھر ذرا اسے بھی سوچو سلیم! کہ وحی کی اس تقسیم سے بالآخر مقصود کیا تھا؟ وہی خدا (وحی کا بھیجنے والا) وہی رسول (جس پر وحی بھیجی جاتی تھی) وہی زبان (جس میں وحی نازل ہوتی تھی۔ وہی مخاطب (جن کی ہدایت کے لئے وحی آتی تھی) دونوں وحیوں کی حیثیت بھی برابر (مثلہٗ معہٗ) لیکن اس کے باوجود کچھ وحی قرآن میں اور کچھ وحی قرآن سے باہر۔ یہ حکم کہ "اٰتوا الزکوٰۃ (زکوٰۃ دو) قرآن میں اور یہ حکم کہ زکوٰۃ بشرح اڑھائی فیصدی دو، قرآن سے باہر۔ کیا قرآن میں "اڑھائی فیصدی" کے الفاظ نہیں لائے جا سکتے تھے؟ کیا اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ[1] تھا؟ سوچو سلیم! کہ اس تقسیم خداوندی میں کونسی مصلحت تھی! یہ تو ہوا عملِ خداوندی کے متعلق عقیدہ کہ اس نے وحی کی اس طرح تقسیم کر دی! اب اس کے بعد عملِ رسالت دیکھئے کہ اس عقیدہ کی رو سے حضورؐ نے وحی کی ایک قسم (متلو) کے متعلق تو اتنی احتیاط برتی کہ اسے تمام و کمال لکھوا دیا۔ شروع سے اخیر تک اسی ترتیب کے مطابق جس میں یہ کتاب ہے، حفاظ کو زبانی یاد کرا دیا۔ ان کے حفظ کردہ کو بار بار سن لیا۔ اور اس طرح یہ وحی قرآن کی دفتین میں محفوظ کر کے امت کو دیدی۔ باقی رہی وحی کی دوسری قسم (روایات) سو اسے نہ کہیں لکھوایا، نہ کسی کو یاد کرایا، نہ اس کا کوئی مجموعہ مرتب کیا، نہ اس کی حفاظت کا کوئی انتظام کیا بلکہ اگر کسی نے از خود تبرکاً کچھ لکھنا بھی چاہا تو اسے روک دیا کہ لا تکتبوا عنی غیر القرآن (مسلم) "مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ نہ لکھو"۔ ذرا غور کرو سلیم! کہ دین نام رکھا جاتا ہے قرآن (وحی متلو) اور سنت (وحی غیر متلو) کا۔ اور دین کے جزو اول کی حفاظت کا تو اس قدر انتظام و اہتمام کیا جاتا ہے اور جزو ثانی کو اس طرح لاوارث چھوڑ دیا جاتا ہے! کیا اس سے رسول اللہؐ کے منصب رسالت (دینِ خداوندی کو انسانوں تک پہنچانے) پر (معاذ اللہ) حرف نہیں آتا؟ کہا جاتا ہے کہ عربوں کا حافظہ اتنا قوی تھا کہ وہ سب کچھ زبانی یاد کر لیا کرتے تھے اس لئے روایات کو لکھوانے کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن اس پر تو غور کرو کہ اگر عربوں کا حافظہ ایسا ہی قابل اعتماد تھا تو پھر قرآن کو کیوں لکھوایا گیا؟ اور پھر یہ بھی کہ جس طرح قرآن کو لفظاً لفظاً یاد کرایا گیا اور ان کے یاد کئے کی تصدیق کی گئی، اسی طرح روایات کو بھی کیوں نہ یاد کرا کر ان کی تصدیق کر دی گئی! "وحی غیر متلو" کی تدوین و تحفظ کے بارے میں عمل خداوندی اور عمل رسالت تم دیکھ چکے۔ اب عمل خلفائے راشدین دیکھئے۔ انھوں نے بڑے ..... اہتمام سے قرآن کریم کے نسخے تیار کئے اور ان مصدقہ نسخوں کو سلطنت کے مختلف گوشوں میں پہنچایا اور حکم دیدیا کہ جہاں کہیں کوئی اختلاف ہو ان مصدقہ نسخوں کی طرف رجوع کیا جائے۔ یہ انتظام انھوں نے دین کے ایک جزو (وحی متلو یعنی قرآن) کے متعلق کیا لیکن دین کے دوسرے جزو (وحی غیر متلو یعنی احادیث) کے متعلق کچھ نہیں کیا۔ نہ صرف یہ کہ خود کچھ نہیں کیا بلکہ جہاں کہیں معلوم ہوا کہ کوئی شخص انفرادی طور پر ان کی تحریر و روایت کی کوشش کر رہا ہے اسے اس سے روکا اور عند الضرورت اس پر سخت مواخذہ بھی کیا۔ (تفصیل اس کی تم کئی بار سن چکے ہو) ذرا سوچو سلیم! کہ یہ تمام تصریحات تمہیں کس نتیجہ پر پہنچاتی ہیں! کیا لامحالہ تم اس نتیجہ تک نہیں پہنچتے کہ یہ عقیدہ بہت بعد کی پیداوار ہے۔ نہ یہ منشائے خداوندی تھا نہ منشائے رسالت اور نہ مسلکِ خلافتِ راشدہ۔ اس تمام عہد میں وحی کی ایک ہی قسم تسلیم کی جاتی تھی جو قرآن میں محفوظ تھی۔ یہی اللہ نے رسولؐ کو دیا، اسی کو رسولؐ نے امت تک پہنچایا اور اسی کو صحابہؓ نے آگے بڑھایا۔

---

[1] سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اس کیلئے یہی دلیل دی ہے کہ اس سے قرآن کی ضخامت بڑھ جانے کا اندیشہ تھا۔

لے ایک بار پھر سن رکھو سلیم! کہ رسول اللہ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب کر کے امت کو نہیں دیا۔ اگر احادیث دین کا جزو ہوتیں تو کیا رسول اللہ پر یہ فریضہ عائد نہیں ہوتا تھا کہ وہ دین کے اس حصے کو بھی مستند طور پر مرتب کر کے امت کو دے کر جاتے؟ احادیث کے مجموعے، حضور کی وفات کے بہت عرصہ بعد لوگوں نے انفرادی طور پر مرتب کئے تھے۔ کیا تم خیال کر سکتے ہو کہ رسول اللہ دین کے ایسے اہم حصے کو اس طرح چھوڑ کر چلے جاتے!! اس سے صاف ظاہر ہے کہ نبی اکرم کے نزدیک یہ حصہ دین کا جزو تھا ہی نہیں۔ جو لوگ اب احادیث کو دین سمجھ رہے ہیں ان سے یہ سوال پوچھئے۔ ان میں سے کوئی شخص اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔

اب یہ دیکھو کہ اس غلط عقیدہ نے دین میں خرابیاں کس قدر پیدا کیں! قرآن اپنی محفوظ شکل میں امت کے پاس موجود تھا اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی تھی۔ اس لئے اس میں ایک حرف کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے برعکس روایات کا کوئی مصدقہ مجموعہ امت کے پاس نہ تھا لیکن انھیں اس عقیدہ کی رو سے قرآن کا ہم پلہ قرار دیا گیا تھا۔ اب سوچئے کہ اس سے دین میں کس قدر تحریف و الحاق کا دروازہ کھل گیا۔ جس کا جی چاہتا کوئی حکم اپنی طرف سے وضع کرتا اور اس کے ساتھ دو چار راویوں کے نام کا اضافہ کر کے اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دیتا، اور یہ حکم دین کا جزو بن جاتا۔ کسی کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا کہ وہ اس کی پرکھ کر سکتا کہ یہ واقعی قولِ رسول ہے یا خود ساختہ روایت۔ معیار تھا تو یہ کہ جن دو چار راویوں کے نام بطور اسناد شامل کئے گئے ہیں، وہ ان پرکھنے والوں کے معیارِ ثقاہت پر پورے اترتے ہیں یا نہیں۔ غور کرو سلیم! کہ جس دین (قرآن) کو خدا اور اس کے رسول نے اتنی احتیاط اور حفاظت سے دیا تھا اس دین میں تحریف و الحاق کے کتنے بڑے فتنے کا دروازہ کھل گیا۔ قرآن میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ارشاد ہے کہ آپ کو بھی اس کی مجال نہ تھی کہ اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کر سکتے۔ قل ما یکون لی ان ابدلہ من تلقائ نفسی۔ ان اتبع الا ما یوحی الی (۱۵/۱۰)" ان سے کہدو کہ میری کیا مجال ہے کہ میں قرآن میں اپنی طرف سے کچھ تغیر و تبدل کر دوں۔ میں تو صرف اسی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے"۔ اور دوسری جگہ ہے کہ ولو تقول علینا بعض الاقاویل۔ لاخذنا منہ بالیمین۔ ثم لقطعنا منہ الوتین (۶۹/۴۴-۴۶) "اگر رسول کسی بات کو یونہی ہماری طرف منسوب کر دیتا تو ہم اسے دائیں ہاتھ سے پکڑ کر اس کی رگ جان کاٹ ڈالتے"۔ لیکن اب واضعین حدیث کیلئے میدان صاف تھا کہ جو جی میں آئے وضع کریں اور اسے رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیں اور جب ان سے کہا جائے کہ یہ تعلیم قرآن میں تبدیلی ہے یا اس پر اضافہ، جس کے رسول اللہ مجاز نہ تھے تو اس کا کھلا ہوا جواب موجود تھا کہ یہ تبدیلی یا اضافہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی طرف سے نہیں کیا۔ یہ تو وحی غیر متلو کے ذریعہ سے کیا تھا جو خدا ہی کی طرف سے تھا اس لئے یہ تغیر و تبدل اور ترمیم و تنسیخ خدا ہی کی طرف سے ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ اس "وحی غیر متلو" نے نہ صرف ان جزئیات ہی کو ابدی طور پر متعین کر دیا جنھیں قرآن نے غیر متعین رکھا تھا بلکہ قرآن کی متعین کردہ جزئیات میں ترمیم و تنسیخ بھی کر دی۔ مثلاً قرآن نے زانی کی سزا سو درے مقرر کی ہے روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ سزا غیر شادی شدہ زانی اور زانیہ کی ہے۔ شادی شدہ کی سزا سنگسار ہے۔ یا قرآن نے کہا تھا کہ ہر شخص اپنے مال کے بارے میں وصیت کر سکتا ہے لیکن روایات (وحی غیر متلو) نے کہدیا کہ یہ وصیت صرف ایک تہائی میں ہو سکتی ہے اور وہ بھی وارثین کے حق میں نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یعنی پہلے تو صرف اتنا ہی اعتراض تھا کہ چونکہ قرآن نے ان احکام کی جزئیات۔۔ خود متعین۔۔ نہیں کیں اس لئے یہ کتاب [illegible]

لیکن اب وحی غیر متلو کے عقیدہ نے یہ کہا۔ ۔ کہ جن ۔ ۔ احکام کی تفاصیل قرآن نے متعین کی ہیں وہ خود ناقص ہیں اور ان کی تکمیل و ترمیم وحی غیر متلو کے ذریعے ہوتی ہے جس کا دروازہ (کم از کم) امام بخاری اور مسلم کے زمانے تک ضرور کھلا تھا۔

کیوں سلیم! کچھ بات سمجھ میں آئی؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے دل میں بار بار یہ خلجان پیدا ہو رہا ہے کہ (i) اس اعتراض کا صحیح جواب تو ابھی تک سامنے نہیں آیا کہ قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین کیوں چھوڑ دیا اور (ii) یہ کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ مسلمانوں میں کس طرح رائج ہو گیا! اگر تم نے اصل مضمون کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا ہوتا تو ان اعتراضات کے جواب بھی وہیں سے مل جاتے۔ لیکن اس دفعہ تو تم نے بھی وہی کچھ کیا جو عوام کیا کرتے ہیں کہ جونہی کوئی خیال ایسا سامنے آیا جو ان کے کسی مروجہ عقیدہ کے خلاف ہو، انھوں نے بلا سوچے سمجھے اعتراضات شروع کر دیئے۔ یہ روش تو تمہاری فطری افتاد کے خلاف تھی۔ لیکن تمہاری معذوری پر میری نگاہ ہے۔ جو عقائد نسلاً بعد نسلٍ متوارث چلے آئیں وہ انسان کے نفسِ غیر شعوریہ کی گہرائیوں میں مسلّم صداقتیں بن کر جاگزیں ہو جاتے ہیں اور آسانی سے اپنی جگہ نہیں چھوڑتے۔ اسلئے اب آؤ ان اعتراضات کی طرف:۔

تم جانتے ہو کہ قرآن، تمام دنیا کے لئے اور ہر زمانے کے لئے ضابطۂ قانون ہے۔ قانون میں ایک چیز ہوتی ہے اصول اور ایک چیز فروع۔ قرآنی ضابطۂ قانون کے اصول، وہ مستقل اقدار ہیں جو ہمیشہ غیر متبدل رہتی ہیں۔ لیکن ان اصولوں کی فروعات، انسان کی تمدنی زندگی کے ان عملی مسائل کا حل پیش کرتی ہیں جو مختلف زمانوں کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ فروعات غیر متبدل نہیں ہو سکتیں۔ قرآن نے (بجز چند ایک فروعات کے) انسانی ہیئت اجتماعیہ سے متعلق قوانین کے اصول بنائے ہیں اور ان کی جزئیات ۔ ۔ متعین نہیں کیں ۔ ۔ ۔ قرآن کا ایک ایک حرف غیر متبدل ہے (لاتبدیل لکلمات اللہ) اگر قرآن جزئیات خود ہی متعین کر دیتا تو ان میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تغیر و تبدل نہ ہو سکتا۔ (جیسا کہ ان چند جزئیات میں نہیں ہو سکتا جو اس نے متعین کر دی ہیں اور جن کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ منشائے ایزدی یہی تھا کہ انھیں غیر متبدل رکھا جائے) اس لئے یہ ضابطۂ قانون (جس میں تمام جزئیات ۔ ۔ ۔ غیر متبدل ہوتیں) ۔ ۔ تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ کے لئے ضابطۂ حیات قرار نہ پا سکتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ یہودیت، عیسائیت، ہندومت وغیرہ آج ۔ ۔ ۔ ۔ ناکام کیوں ہوئے ہیں! انھیں ۔ ۔ ۔ ان کے اپنے پیروؤں نے کیوں چھوڑ دیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خوشی سے نہیں چھوڑا۔ انتہائی مجبوری کی وجہ سے چھوڑا ہے۔ وہ مجبوری کیا تھی! یہی کہ کسی زمانہ میں جو مذہبی رسوم و قیود (یعنی جزئیاتِ قانون) متعین ہوئیں وہ ان مذاہب میں غیر متبدل قرار پا گئیں۔ اب وہ جزئیات عصرِ حاضر کے انسان کے تمدنی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتی تھیں۔ اربابِ مذہب اس عقیدہ کی بنا پر کہ وہ غیر متبدل ہیں، ان کی پابندی پر مصر تھے۔ کچھ عرصہ یہ کشمکش رہی اور بالآخر ان کے معتقدین، وقت کے اٹل تقاضوں سے ایسے مجبور ہوئے کہ انھیں ان جزئیات کو جھٹک کر پھینک دینا پڑا اور چونکہ ان کی آسمانی کتاب ان کے پاس اپنی اصلی شکل میں تھی نہیں اس لئے ان جزئیات کے ساتھ ہی مذہب بھی گیا۔ (در اصل ان کے ہاں مذہب نام ہی ان جزئیات کا رہ گیا تھا) تم نے دیکھا سلیم! کہ یہودیوں کو تالمود کی جزئیات، عیسائیوں کو سینٹ پال کی جزئیات اور ہندوؤں کو سمرتی کی جزئیات، جنھیں ابدی اور غیر متبدل کہا جاتا تھا، کس طرح زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر الگ کرنی پڑیں۔ قرآن کے پیشِ نظر جہاں انسانی زندگی کے نشو و ارتقاء کے لئے مستقل اقدار اور غیر متبدل اصول تھے وہاں اس کی

تمدنی زندگی کے ہمیشہ بدلنے والے تقاضے بھی تھے۔ اس لئے اس نے ایسا ضابطۂ حیات دیا جس میں انسانی زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھا گیا تھا اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر اس میں نوع انسانی کے لئے ابدی ضابطۂ حیات بننے کی صلاحیت ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے سلیم! کہ قرآن نے جزئیات کو اس لئے متعین نہیں کیا کہ وہ انھیں قابل تغیر و تبدل رکھنا چاہتا تھا۔ اگر کسی ایک زمانے میں متعین شدہ جزئیات ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنی مقصود ہوتیں تو قرآن انھیں خود ہی متعین کر دیتا۔ لہٰذا قرآن کے غیر متعین جزئیات کو کسی زمانے میں متعین کر کے انھیں آئندہ کے لئے غیر متبدل قرار دیدینا دین کی اس صلاحیت کو سلب کر لیتا ہے جس کی بنا پر یہ ابدی طور پر ضابطۂ حیات بن سکتا ہے۔ ذرا سوچو سلیم! کہ اگر کسی اسلامی حکومت کو یہ مجبوری ہو کہ وہ کسی حالت میں بھی اڑھائی فیصدی سے زیادہ انکم ٹیکس عائد نہ کر سکے اور وہ ٹیکس (زکوٰۃ) بھی سال بھر کے فاضلہ اثاثہ (Surplus Assets) پر ہو تو وہ حکومت کبھی چل سکتی ہے؟ قرآن نے زکوٰۃ کا حکم دے کر اس کی شرح و قیود کو غیر متعین چھوڑ دیا تاکہ ہر زمانے کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق اسے خود متعین کرتی رہے۔ قرون اولیٰ میں خلافت راشدہ نے اپنے زمانے کی ضرورت کے مطابق اڑھائی فیصدی مناسب سمجھا اس وقت یہی شرح شرعی تھی۔ اگر آج کوئی اسلامی حکومت کہے کہ اس کی ضروریات کا تقاضا بیس فیصدی ہے تو یہی بیس فیصدی شرعی شرح قرار پا جائے گی۔

یہ ہے وہ مصلحت سلیم! جس کی بنا پر قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین چھوڑ دیا۔ اب کسی ایک وقت کی متعین کردہ جزئیات کو ابدیت سے ہمکنار کر دینا اس دین فطرت کو غیر فطری بنا دینا ہے۔ سلیم تم مجھ سے زیادہ اس حقیقت سے واقف ہو کہ عصر حاضر کا مسلمان اگر مذہب سے بیگانہ بلکہ سرکش ہو رہا ہے تو اس لئے کہ اسے ان جزئیات کو ماننے پر مجبور کیا جا رہا ہے جو اس کے موجودہ زمانے کے تقاضوں میں فٹ (FIT) نہیں ہوتیں۔ اگر اس کے سامنے قرآن کے اصول رکھ کر اس سے کہا جائے کہ ان اصولوں کی حدود میں رہتے ہوئے اپنے زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے والی جزئیات خود متعین کر لو، تو دیکھو وہ کس طرح لبیک اللھم لبیک کہتا ہوا اس حریم فطرت کے گرد مستانہ وار طواف کرنے لگتا۔ قرآن کی تو یہ کیفیت ہے سلیم! کہ

صد جہان تازہ در آیاتِ اوست　　　عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست　　　ہر جہاں اندر بر او چو قباست
چو کہن گردد جہانے در برش　　　می دہد قرآں جہانے دیگرش

اب دوسری شق لیجئے یعنی یہ کہ یہ جزئیات، غیر متبدل کس طرح قرار پا گئیں۔ اسی کو بالفاظ دیگر یوں کہئے کہ وحی غیر متلو کا عقیدہ کیسے پیدا ہو گیا۔

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے، قرآن نے ان جزئیات کو غیر متعین اسلئے چھوڑ دیا تھا کہ ہر زمانے کی اسلامی حکومت اپنی اپنی ضروریات کے مطابق ان کا تعین خود کرے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی حکومت کی تشکیل فرمائی لہٰذا حضورؐ نے سب سے پہلے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان غیر متعین جزئیات کو متعین فرمایا۔ آپؐ کے بعد خلافت راشدہ کے زمانے میں ان جزئیات میں حسب ضرورت اضافے بھی ہوئے ہیں اور ترمیمات بھی۔ سلیم! تم حیران ہو گے کہ وحی غیر متلو کے عقیدہ کا سراغ نزول آیت کے

زمانے میں کہیں ملتا ہے نہ صحابہؓ کے عہد میں۔ وہ زمانہ اس اصطلاح سے قطعاً ناواقف نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک وحی ایک ہی تھی اور وہ قرآن میں محفوظ تھی۔ اس سے باہر وحی کہیں نہ تھی اس لئے خارج از قرآن کوئی چیز غیر متبدل بھی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور سلاطین نے امورِ سلطنت اپنے ذمہ رکھ لئے اور امورِ دین کو انفرادی طور پر علماء[1] کے سپرد کر دیا تو قرآنی اصولوں کے جزئیات متعین کرنے کا جو اسلوب قرآن نے بتایا تھا (یعنی بذریعہ حکومت) وہ خود بخود مٹ گیا جن لوگوں کے ذمے امورِ دین کا تحفظ قرار پایا انھوں نے سوچا کہ مرکزی قوت (حکومت) نے جزئیات کو قانون کی حیثیت دیکر نافذ کرنے کا طریقہ ترک کر دیا ہے۔ اس لئے اگر مروجہ جزئیات کے متعلق یہ کہدیا گیا کہ وہ صرف اس زمانے کے لوگوں کے لئے شریعت تھیں جن کے لئے انھیں مرتب کیا گیا تھا تو ملت شریعت کے بغیر رہ جائے گی اور اس طرح ان میں سخت انتشار (Anarchy) پھیل جائے گا۔ لہٰذا ملت کو کسی آئین پر پابند رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ اس وقت کی مروجہ جزئیات کو غیر متبدل قرار دے کر واجب التعمیل ٹھہرا دیا جائے۔ ان کو غیر متبدل قرار دینے کا ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ یہ کہ انھیں تمام و کمال ذاتِ رسالتمآبؐ کی طرف منسوب کر دیا جائے اور یہ کہدیا جائے کہ حضورؐ نے انھیں بذریعہ وحی متعین فرمایا تھا اس لئے یہ ابدی طور پر ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انھیں وحی قرار دینے میں یہ بھی مصلحت تھی کہ جو لوگ ذاتی اجتہادات سے مسائل میں استنباط کر کے جزئیات متعین کر رہے تھے (یعنی اہلِ فقہ) اس عقیدے کی رو سے ان کے رد کی ناقابلِ تردید دلیل مل جاتی تھی۔ یعنی ایک چیز کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ اسے حضورؐ نے بذریعہ وحی متعین فرمایا اور دوسری کے متعلق یہ کہ اسے (مثلاً) امام ابو یوسفؒ نے اپنی رائے سے متعین کیا تو ظاہر ہے کہ ہر شخص کی جبینِ عقیدت طول الذکر کے سامنے جھکے گی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں سلیم! جزئیات کو غیر متبدل قرار دینے کا اولیں جذبہ محرکہ یہی تھا۔[2] یعنی ملت کو بالکل بے زمام چھوڑ دینے یا اشخاص کی ذاتی آراء کے تابع کر دینے کے بجائے انھیں تقلید کی حدود میں مقید کر دیا جائے۔ یہ طریق ایک اضطراری حالت کے لئے وقتی علاج تو ضرور تھا لیکن اس سے وضع احادیث کا اتنا بڑا دروازہ کھل گیا کہ جو کچھ کسی کے جی میں آیا اس نے قال رسول اللہؐ کے عنوان سے دو چار رواۃ کی تائید کے ساتھ گھڑا اور اسے جزوِ دین بنا دیا۔ اب یہی دین ملت کے لئے ابدی طور پر ناقابلِ تغیر شریعت بن گیا۔ جب تک حکومت اور مذہب کی یہ تفریق باقی رہی یہ سوال عملی طور پر بے معنی تھا کہ یہ جزئیات جو تقلیدی طور پر اسلاف سے منتقل ہوتی آ رہی ہیں علیٰ حالہٖ رہنی چاہئیں یا ان میں تغیر و تبدل ہونا چاہیئے۔ اسلئے کہ حکومت سے الگ ہٹ کر یہ جزئیات مذہبی رسوم سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ زکوٰۃ اڑھائی فیصدی ہوتی یا چالیس فیصدی دونوں صورتوں میں خیرات سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اب بھی جہاں جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے لیکن مذہب، حکومت سے الگ ہے، وہاں

---

[1] سلیم! تم حیران ہو گے کہ علماء کا ایک جداگانہ طبقہ اور مولوی اور مولانا کے الفاظ نہ عہدِ رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں کہیں دکھائی دیتے ہیں نہ خلافتِ راشدہ میں۔ یہ بھی اس زمانہ کی پیداوار ہیں جب سلطنت دین سے الگ ہو گئی اور "قیصر اور پوپ" کے دوائرِ منصب جداگانہ قرار پا گئے۔ حضرت مولانا ابوبکر صدیقؓ اور حضرت مولیٰ عمر فاروقؓ آج بھی کس قدر نامانوس نظر آتے ہیں۔

[2] یہ میں اسوقت اس سازش سے بحث نہیں کر رہا جو عجمی عناصر یہودیت، عیسائیت اور مجوسیت نے اسلام سے انتقام لینے کی غرض سے کی اور جس کی رو سے انھوں نے روایات سازی کے راستے اپنے خیالات اور عقائد کو دین اسلام بنا کر دکھایا۔ اس کے متعلق دوسرے مقامات پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

ان جزئیات کی حیثیت مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس لئے اب سے پہلے اس سوال نے عملی حیثیت اختیار نہیں کی۔ لیکن حصولِ پاکستان کے بعد یہ آواز ہر در و دیوار سے اٹھنی شروع ہوگئی ہے کہ اس کا آئین شرعی ہونا چاہئے (اور یہی تشکیلِ پاکستان کا مقصد بھی ہے) لہٰذا اب اس سوال نے بھی عملی شکل اختیار کرلی ہے کہ یہ جزئیات جو ہمارے ہاں متوارث چلی آرہی ہیں، ناقابلِ تغیر ہیں، یا زمانے کے مقتضیات کے مطابق ان میں تغیر و تبدل بھی ہوسکتا ہے۔ جو لوگ دل سے چاہتے ہیں کہ یہاں نظامِ شریعت رائج کیا جائے وہ بھی اس خیال سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر شریعت انہی جزئیات کے مجموعہ کا نام ہے جسے اربابِ شریعت ناقابلِ تغیر قرار دے رہے ہیں تو پاکستان کا نظام چل کیسے سکے گا؟ اربابِ شریعت کا اصرار ہے کہ یہ جزئیات ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ انھیں چھوا تک نہیں جاسکتا۔ اس لئے انھیں اسی طرح اختیار کرنا ہوگا۔ انھیں اس سے کچھ واسطہ نہیں کہ ایسا کرنے سے ہم اس زمانے میں زندہ بھی رہ سکتے ہیں یا نہیں۔ تقلید کا خاصہ یہ ہے کہ اس میں ذرائع کو مقصود بالذات سمجھ لیا جاتا ہے اور اعمال کو کبھی نتائج سے نہیں پرکھا جاتا۔ تمہیں یاد ہے ایک دفعہ دہلی میں ہم ایک پریس میں گئے تھے۔ وہاں ایک بہت بڑی روٹری مشین پوری سرگرمی سے چل رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر۔ پورے زور و شور کے ساتھ، لیکن اس کے تختہ پر کاغذ نہیں تھا اس لئے گو مشین تو چل رہی تھی لیکن چھپتا کچھ نہیں تھا مسلمانوں کے اعمالِ مذہبی کی مشین صدیوں سے چل رہی ہے لیکن اس پر چھپتا کچھ نہیں ۔ اولئك حبطت اعمالهم (ان کے عمل بے نتیجہ رہتے ہیں) اور ضل سعیهم (ان کی کوششیں رائیگاں)۔ لیکن اب سلیم! خدا خدا کرکے ہمیں ایک ایسا موقعہ ملا ہے جس میں حکومت ہمارے ہاتھ میں ہے اور ملوکیت کا استبداد و تغلب ہنوز ہم پر مسلط نہیں ہوا۔ ہم اس پر قادر ہیں کہ جس قسم کا آئین چاہیں بنالیں۔ صدیوں کے بعد پھر وہ وقت آیا ہے کہ ناموسِ فطرت ہم سے پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ

تو اپنی سرنوشت پھر اپنے قلم سے لکھ ۔۔۔ خالی رکھی ہے خامۂ حق نے تری جبیں

اگر سلیم! اس وقت ہم نے مبداءِ فیض کی اس موہبتِ کبریٰ سے فائدہ نہ اٹھایا تو پھر قرآن ہماری زندگی کا ضابطۂ حیات کبھی نہیں بن سکے گا۔ اور ہم آزادی کی فضائے بسیط میں کبھی سانس نہیں لے سکیں گے۔ میں سلیم! تمہیں اپنا سینہ چیر کر اپنے درد و کرب کی تلاطم خیزیوں کو کس طرح دکھاؤں جنھوں نے مجھ پر راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام کر رکھا ہے۔ سلیم

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں ۔۔۔ میرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں

میرے نالۂ نیم شب کا نیاز ۔۔۔ میری خلوت و انجمن کا گداز

تم نہیں دیکھ سکتے۔ میں پاکستان کے وسیع و عریض خطہ پر نگاہ ڈالتا ہوں تو عام طور پر یہ دیکھتا ہوں کہ

نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق

اور ایک ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ

آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق

مجھے سلیم! یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ ہمارے نظامِ شریعت کے دعویدار وہی ہیں جن کا ایمان ہے کہ فقہ و روایات کی وہ

جزئیات جو ہزار سال پیشتر وقتی . . . تقاضوں کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی تھیں، ناقابلِ تغیر و تبدل ہیں۔ اس لئے وہ انہی جزئیات کے مجموعہ کو قانونِ شریعت بتا کر سامنے لے آئیں گے جو آج کے حالات میں کبھی قابلِ عمل نہ ہو سکے گا اور مسلمان اس سے ایسا بدکے گا کہ دوبارہ اس کی طرف رُخ نہیں کرے گا۔ اور اس طرح اللہ کی یہ نعمتِ عظمیٰ ہماری شامتِ اعمال سے بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔ یہ صرف ہم پر ہی ظلم نہیں ہوگا بلکہ تمام نوعِ انسانی پر ظلم ہوگا کہ اس سے انسانیت اس نور سے محروم رہ جائے گی جس میں اسے اپنے شرف و مجد کی ارتقائی منازل طے کرنی تھیں۔ وذالك خسران المبين۔

سلیم! تم کہتے ہو کہ جب اصولِ قانون، اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیئے اور ان کی جزئیات امت نے اپنے اپنے زمانے میں متعین کیں تو رسول اللہ پر ایمان لانے سے کیا مفہوم ہوگا! تمہارے اس سوال پر مجھے حیرت ہوئی اس لئے کہ تم کبھی اس قسم کا سطحی اعتراض نہیں کیا کرتے تھے۔ ذرا سوچو کہ جب ایک مسلمان کہتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے تو اس کے پاس اس دعویٰ کی دلیل کیا ہے؟ تاریخ شاہد ہے (اور اس کا مسلمان کو خود اقرار ہے) کہ دنیا کو قرآن محمد ابن عبداللہ نے دیا تھا۔ پھر یہ خدا کا کلام کیسے ہوا؟ اس کا صرف ایک ثبوت ہے کہ خود محمد ابن عبداللہ نے یہ کہا ہے کہ یہ کلام میرا نہیں، خدا کا ہے۔ اس لئے جب تک کوئی شخص محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان نہ لائے قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر ایمان نہیں لا سکتا۔ اور قرآن ہی حکومتِ خداوندی کا ضابطۂ قانون ہے۔ اس لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان اس وقت تک وجہ شرف انسانیت ہے جب تک انسان اللہ کی حکومت کو باعثِ احترامِ آدمیت سمجھتا ہے[1]۔ پھر اسے بھی سوچو سلیم! کہ اس حقیقت سے بھی تو ہمیں حضور رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی آشنا کرایا کہ قرآنی اصولوں کی جزئیات خود ہمیں متعین کرنی ہیں۔ اگر حضورؐ انھیں متعین کر کے حکومتِ خداوندی کو تشکل نہ فرماتے تو ہمیں کیا معلوم ہوتا کہ منشائے خداوندی کیا ہے؟

گر عشق نہ بودے و غم عشق نہ بودے اینہا سخنِ نغز کہ گفتے کہ شنودے

لیکن حضورؐ کی سیادت تو اسی میں تھی کہ آپ نے انسان کو اس کے صحیح مقام سے آگاہ کر دیا اور . . . . . صحیح حریتِ فکر و نظر عطا کر کے اسے ان اغلال و سلاسل کی پابندیوں سے آزاد کر دیا جس میں وہ جکڑا چلا آتا تھا۔ یہ اغلال و سلاسل وہ استبداد، جو ملوکیت اور برہمنیت کی شکل میں انسانی اعصاب پر سوار . . . تھا حضورؐ نے بتایا کہ انسان کا تعلق اس کے خدا کے ساتھ براہِ راست ہے اور خدا اور بندے کے درمیان، اور تو اور، خدا کا رسول بھی حائل نہیں ہو سکتا۔ یہ انداز حکومت (کہ اصول خدا نے متعین کئے ہیں اور ان کی جزئیات انسان خود متعین کریں گے) خدا اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے وہ عدیم المثال تعلیم جسے قرآن نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے کہ

ما كان لبشر ان يوتيه الله الكتاب والحكم والنبوة ثم يقول للناس كونوا عبادا لي من دون الله۔ ولكن

---

[1] اس باب میں مزید وضاحت کسی دوسرے مقام پر پیش کی جائے گی۔

کونوا ربّانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون ۔ ۳/۷۸

کسی انسان کو یہ بات سزاوار نہیں کہ اللہ اسے کتاب وحکومت ونبوت عطا فرمائے اور پھر اس کا شیوہ یہ ہو کہ لوگوں سے کہے خدا سے ورے میرے بندے بن جاؤ۔ (اس کا شیوہ یہ ہوگا کہ وہ لوگوں سے کہے کہ) تم سب ربانی انسان بن جاؤ (اور اس کا طریق یہ ہے کہ) تم کتاب اللہ کی تعلیم دیتے رہتے ہو اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول رہتے ہو۔

رسول کا منصب یہ ہے کہ وہ اپنے فقید المثال عمل سے انسانوں کو یہ سکھائے کہ وہ کس طرح ربانی انسان بن سکتے ہیں۔ یعنی ان کا اور ان کے خدا کا براہِ راست تعلق کس طرح پیدا ہو سکتا ہے اور اس تعلق کا ذریعہ کتاب اللہ ہے۔ اس تعلق کی عملی شکل پہلے رسول اللہؐ نے خود متعین کر کے دکھائی۔ آپؐ کے بعد آپؐ کی امت کو چاہیئے تھا کہ اس تعلق کو مسلسل قائم رکھے۔ لیکن امت بہت جلد اس راستہ سے بھٹک گئی اور اس نے اپنے اور خدا کے درمیان وہی انداد (غیر خدائی قوتیں) حائل کر لئے جنھیں درمیان سے ہٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔ اور جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہٹا کر پھینک دیا تھا۔ یہ انداداً من دون اللہ کہیں ارباب سیاست تھے اور کہیں احبار ورہبان۔ جنھوں نے خدائی احکام کی جگہ اپنے احکام کی پرستش کرائی۔ کسی نے قیاسات کی رو سے کسی امام کا آسرا لیکر اور کسی نے روایات کے راستے خود رسول اللہؐ کا سہارا لیکر۔ حالانکہ نہ ان ائمہ نے اس کی تلقین کی تھی اور نہ رسول اللہؐ نے اس کی تعلیم دی تھی۔ تو پھر سلیم! کوئی تو وقت ایسا آنا چاہیئے جب امت کو اس بے راہ روی سے روک کر اسے راستہ پر لگایا جائے جس سے اس کے اور اس کے خدا کے درمیان پھر براہِ راست تعلق پیدا ہو جائے۔ میرے نزدیک پاکستان نے وہ موقعہ بہم پہنچا دیا ہے۔ لیکن اگر اب بھی ہمارے اور ہمارے خدا کے درمیان وہی انداداً من دون اللہ حائل رہے۔ یعنی یا حکومت ارباب سیاست کے اپنے تصورات کے مطابق قائم ہو گئی یا ہمارے احبار ورہبان کے اشخاص پرستی کے معتقدات کے مطابق تو پھر خدا اور بندے کا ٹوٹا ہوا رشتہ شاید دوبارہ نہ جڑ سکے۔ یہ خدشہ ہے سلیم!

میرے دیدۂ تر کی بے خوابیوں، اور میرے دل کی پوشیدہ بیتابیوں

کا باعث۔

اس آخری ٹکڑے سے سلیم! تم نے یہ بھی سمجھ لیا ہوگا کہ "اسلامی نظام" محض چند قوانین کے مجموعے کا نام نہیں جو کسی قوم (یا ایک حکومت کے تابع آجانے والے انسانوں) کی اجتماعی زندگی میں نظم وضبط قائم رکھنے کے لئے میکانکی طور پر نافذ کر دیئے جائیں گے۔ قانون کیا ہے؟ انسانوں کو ان افعال سے روکنے کا ذریعہ جن سے ان کی تمدنی زندگی میں فساد وانتشار واقعہ ہوتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے مختلف قوموں (یا جماعتوں اور سلطنتوں) نے مختلف انداز وطرق (قوانین) وضع کئے ہیں۔ ان میں اکثر قوانین مشترک بھی ہیں۔ مثلاً قاتل کی سزا (موت) انگریز کے قانون میں بھی وہی ہے جو قرآن کے قانون میں ہے۔ اس اعتبار سے انگریز کے قانون اور ہمارے شرعی قانون میں کوئی فرق نہیں۔ اب فرض کرو کہ اگر انگریز مختلف جرائم کی وہی سزائیں اپنے ہاں رائج کر لیتا ہے جنھیں ہم شرعی حدود کہتے ہیں تو کیا سلیم! اس سے یہ سمجھا جائے گا کہ انگریز کا نظامِ زندگی اسلامی ہو گیا؟ بالکل نہیں ...... ایک قدم آگے بڑھو۔ اگر ہم بھی

اپنے ہاں جرائم کی وہی سزائیں تجویز کرلیں جنھیں شرعی تعزیرات کہتے ہیں تو کیا اس سے یہ لازم آجائے گا کہ ہمارا نظامِ زندگی اسلامی ہوگیا! ہرگز نہیں۔ اس سے سلیم! تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ شرعی قوانینِ جرم و سزا کو نافذ کردینے کا نام اسلامی نظام نہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ قوانین شرعی، نظامِ اسلامی کا ایک جزو ہیں۔ اس وقت تک جسقدر مطالبات پیش ہورہے ہیں وہ محض قوانین شرعی کی تنفیذ کیلئے ہورہے ہیں اگر ہماری حکومت ان شرعی قوانین کو اختیار کرلے تو ہمارے اربابِ شریعت مطمئن ہوجائیں گے کہ "حکومتِ خداوندی" کا قیام ہوگیا۔ لیکن ادھر ان قوانین کا نفاذ ہوگا اور اُدھر ان قانونی موشگافیوں کے ذریعہ ان قوانین کی گرفت سے بچنے کے حیلے وضع کئے جائیں گے۔ سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں ایک باب بابُ الحیل بھی ہوتا ہے یعنی وہ حیلے جن سے مجرم قانونی گرفت سے بچ سکتا ہے۔ تم حیران ہوگے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں! لیکن سلیم! میں ایک حقیقت بیان کررہا ہوں۔ یقین نہ آئے تو ان کتابوں کو اٹھا کر خود دیکھ لو اور پھر علامہ ابن قیم رح کی اعلام الموقعین دیکھو جس میں ان "شرعی حیلوں" کا رد کیا گیا ہے۔ تمہاری دلچسپی کے لئے ان حیل میں سے ایک حیلہ مثالاً لکھتا ہوں۔ اس سے تم سمجھ بھی جاؤگے کہ "شرعی حیلوں" سے مفہوم کیا ہے۔ دو آدمیوں نے مل کر ایک مکان سے مال چرایا اور موقعہ پر گرفتار ہوگئے۔ عدالت میں پیش ہوئے جرم ثابت تھا۔ شرعی تعزیر کی رو سے چور کا ہاتھ کاٹنا چاہیئے۔ لیکن اب دیکھئے کہ یہ کس طرح اس سزا سے بچتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے کہ سرکار! میں نے صرف نقب لگائی ہے۔ نقب لگانا چوری نہیں۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے بیشک مال اکٹھا کیا اور اسے لیکر چلا۔ لیکن منقوب دکان میں پڑا ہوا مال، مالِ محفوظ نہیں کہلا سکتا۔ اور چوری مالِ محفوظ کو لے جانے کا نام ہے۔ لہذا مجھ پر چوری کا جرم عائد نہیں ہوسکتا۔ لیجئے دونوں چور چوری کے جرم سے بری ہوگئے۔ اب ان پر کوئی اور فردِ جرم لگائیے۔ اس قسم کے حیلے سلیم! روز عدالتوں میں ہوتے رہتے ہیں۔ وکلاء کے معاش کا بیشتر حصہ اسی قسم کی حیلہ تراشیاں ہیں۔ لہذا محض شرعی قوانین کے تنفیذ سے نفوس میں اصلاح نہیں ہوسکتی۔ قلوب میں انقلاب، اسلامی نظام کے قیام سے ہوگا۔ اسلامی نظام کیا ہے؟ اے سلیم! میں تمہیں اس خط میں نہیں سمجھا سکتا اس کیلئے تمہیں معارف القرآن کی پانچویں جلد کا انتظار کرنا ہوگا یا اگر مجھے اللہ نے فرصت دی تو اس کی اشاعت سے قبل کہیں جداگانہ بھی لکھ دوں گا[1]۔ لیکن وہ پھر بھی جامع اور مکمل نہیں ہوگا۔ اسلامی نظام انسانی زندگی کو اس طرح محیط ہوتا ہے جس طرح فضا کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہوا انسانی جسم کو لپیٹے ہوتی ہے اور بایں نمط کہ یہ کرۂ ہوائی اسکی زندگی کا مدار و اساس ہوتے ہوئے اس کی آزادیوں میں کہیں خلل انداز نہیں ہوتا۔ چلتے چلتے چند الفاظ میں سلیم! یوں سمجھ لو کہ

(۱) کائنات ایک مقصد کے ماتحت پیدا کی گئی ہے۔ وہ اس منزلِ مقصود کی طرف رواں دواں جارہی ہے۔

(۲) اسی طرح انسان کی زندگی بھی ایک مقصد لئے ہوئے ہے اور اس کی تگ و تاز کا منتہیٰ اس نصب العین کی طرف بڑھنا ہے۔

(۳) خارجی کائنات میں ہر شے بلا اختیار و ارادہ اس مقصود کی طرف بڑھ رہی ہے۔

(۴) لیکن انسان اپنی دنیا میں صاحبِ اختیار و ارادہ ہے اسلئے اسے اس نصب العین کی طرف اپنے نظامِ اجتماعیہ کی رو سے بڑھنا ہوگا۔

(۵) اس نظامِ اجتماعیہ کا نام الدین یعنی اسلامی نظامِ زندگی ہے جس کی بنیاد وحدتِ خالق، وحدتِ قانون، وحدتِ انسانیت اور وحدتِ مقصد پر ہے۔

(۶) اس نظام کا اولین نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس میں ہر فردِ معاشرہ کی تمام انسانی صلاحیتوں کے کامل طور پر نشوونما پانے کیلئے تمام اسباب و ذرائع ہر ایک کیلئے یکساں طور پر میسر ہوتے ہیں۔ اس کو نظامِ ربوبیت کہتے ہیں۔

---

[1] اس کے متعلق اس کے بعد طلوع اسلام میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔

لہٰذا قوانین تعزیرات اس نظام کا ایک جزو ہیں جو افرادِ معاشرہ کی اجتماعی زندگی میں بدعنوانیوں کی روک تھام کیلئے نافذ کئے جاتے ہیں لیکن اس کے یہ معنی نہیں سلیم! کہ آپ اس جزو کو اگر جاری کر سکتے ہیں تو اتنا بھی نہ کریں بمقصود پورے کے پورے اسلامی نظام کو جاری کرنا ہوگا۔

چونکہ اسوقت بحث صرف یہ تھی کہ شرعی قوانین کی ترتیب و تدوین کس طرح عمل میں آئیگی۔ اسلئے میں نے اپنے مضمون "اسلامی نظام" میں صرف اسی نقطہ تک اپنے آپ کو محدود رکھا ہے۔ اس مضمون کے عنوان سے اس کو اسلامی نظام نہ سمجھ لینا۔ اس مضمون میں اسلامی نظام کے صرف ایک گوشے سے بحث کی گئی ہے۔ یہ چیز کہ یہ گوشہ (یعنی ضابطۂ قوانین) کس طرح پورے نظام کا جزو بن کر اس مقصدِ عظیم کے حصول میں ممد ہوتا ہے، جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے سمجھ میں نہیں آسکتی جبتک پورے کا پورا اسلامی نظام اور اس کا منتہیٰ آپ کے سامنے نہ ہو۔ اس کیلئے سلیم!

کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر[1]

اب سلیم! تمہاری آخری بات کا جواب آتا ہے۔ یہ تہیں تسلیم ہے کہ ایسے معاملات سامنے آسکتے ہیں جن کی جزئیات نہ قرآن نے متعین کی ہیں اور نہ وہ کہیں روایات میں ملتی ہیں۔ اب اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ جزئیات کی تعیین صرف رسول ہی کر سکتا ہے تو ان امور کی جزئیات کو کون متعین کرے گا؟ اس لئے کہ اب بابِ رسالت تو بند ہو چکا ہے۔ یہی وہ الجھن جس کیلئے کہیں ہر صدی کے اخیر ایک مجدد کا عقیدہ وضع کرنا پڑا اور کہیں مہدی آخرالزماں کا انتظار اٹھانا پڑا۔ اسی سے مدعیانِ نبوت نے فائدہ اٹھایا اور انھوں نے رسالت کا دروازہ کھول دیا۔ اگر یہ سمجھ لیا جاتا کہ جزئیات کی تعیین امت کا فریضہ ہے تو پھر نہ کسی الگ مجدد کی ضرورت پڑتی نہ کسی جداگانہ مہدی کی۔ نہ یہ کرسیاں رکھی جاتیں نہ ان پر کوئی نبی بن کر بیٹھنے کی جرأت کرتا۔ تجدید و ہدایت کا سلسلہ مسلسل و متواتر قائم رہتا۔ لیکن مسلمانوں نے یہ نہ کیا اور جب اس غلط بینی سے پیچیدگیاں پیدا ہوئیں تو ان کے ایسے ایسے حل تجویز کئے جن سے وہ خواب پریشاں سے پریشاں تر ہوتا چلا گیا۔ تم کہتے ہو کہ اس قسم کے امور کے لئے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ یہی میں کہتا ہوں۔ فرق یہ ہے کہ تم کہتے ہو کہ جو اجتہاد پہلے ہو چکا ہے اس میں مزید اجتہاد نہیں ہو سکتا۔ میں کہتا ہوں کہ اجتہاد کے محتاج ہوتے ہی وہ امور ہیں جن میں مقتضیاتِ زمانہ کی رو سے رد و بدل ہو سکتا ہو۔ جن امور کو اللہ تعالیٰ نے کھلا چھوڑ دیا ہے ان میں کسی ایک زمانہ کا اجتہاد ابدی فیصلہ نہیں بن سکتا۔ اگر اسے ابدی فیصلہ بننا ہوتا تو اس کا فیصلہ خود قرآن کر دیتا۔ اور اسے اجتہادِ انسانی کیلئے آزاد نہ رکھتا۔ البتہ ہم اپنے زمانے کے اجتہاد کیلئے ان تمام اجتہادات سے مستفید ہوں گے جو ہم سے پہلے کئے گئے ہیں۔ علاوہ بریں یہ اجتہاد انفرادی نہیں ہوگا۔ بلکہ ملت کے نمائندے تمام معاملات پر غور و فکر کے بعد اجتہاد کریں گے اور اس سے یہ جزئیات مرتب ہوں گی۔ یہ ہے وہ طریق سلیم! جس سے ہم خدا کے ازلی اصولوں کی روشنی میں کہ جو درحقیقت ان کی زندگی ہی کے ترجمان ہیں، ہر زمانے کے مسائل کے نئے نئے حل دریافت کرتے چلے جائیں گے۔ یہ ہے دینِ مبین۔

لایزال و وارداتش نو بنو برگ و بار محکماتش نو بنو

باطنِ او از تغیر بے غمے ظاہرِ او انقلابِ ہر دمے

---

[1] دیکھئے مسودہ دستورِ اساسی پیش کردہ طلوعِ اسلام۔

بشریتِ رسول

شرفِ آدمیت کا نقطۂ ماسکہ اور تحریکِ انقلاب کا بنیادی اصول

(از محترم ایس۔ این۔ باقر صاحب)

"نہیں باقر صاحب!" میرے دوست نے آہ بھرتے ہوئے کہا "معاملہ اس حد تک بگڑ چکا ہے کہ اس کی اصلاح میرے اور آپ کے بس کی بات نہیں۔ ساری دنیا کے مسلمانوں پر نگاہ ڈالئے۔ کہیں زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ ہر جگہ تنزل۔ ہر مقام پر پستی ہر شعبے میں انحطاط۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان حالات میں تبدیلی پیدا کرنا کسی انسان کے بس کی بات ہے۔ میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اب کوئی رسول ہی آکر انقلاب پیدا کرے تو کرے، اور رسول بھی ایک آدھ نہیں۔ چالیس کروڑ مسلمانوں کے لئے کم از کم آٹھ دس رسول ہوں تو کام چلے گا۔"

یہ الفاظ میرے اُس دوست تک ہی محدود نہیں بلکہ ترجمان ہیں پوری کی پوری مسلمان قوم کے جو اپنی اصلاح کے معاملہ میں عملاً مایوس ہو چکی ہے۔ آپ کسی مسلمان سے بات کیجئے۔ سب کچھ کہہ سن لینے کے بعد بات یہیں آکر رک جائے گی کہ "یہ کچھ کرے کون"؟ اور اس کے بعد اطمینان کی صورت صرف یہ کہہ لینے سے پیدا کر لی جائے گی کہ کوئی آنے والا آئیگا اور وہی یہ کچھ کرے گا۔

یہ تصور مسلمانوں تک ہی محدود نہیں۔ تاریخ اقوامِ عالم پر نگاہ ڈالئے۔ دنیا میں ہر وہ قوم جو پستیوں میں گر چکی ہے یا زوال آمادہ ہے، اس کی بعینہٖ یہی روش ہے۔ وہ جب اپنے درخشندہ ماضی پر نگاہ ڈالتی ہے تو اس کی نگاہوں میں چمک پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد جب اپنے حال کو دیکھتی ہے تو ٹھنڈی سانس بھرتی ہے۔ ازاں بعد جب وہ بزعمِ خویش، حالات کا تجزیہ کرتی ہے تو اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ اس کے جن اسلاف نے اس قسم کا انقلاب پیدا کر دیا تھا ان میں خاص خدائی قوتیں تھیں۔ وہ قوتیں انہی کا حصہ تھیں۔ ہمیں وہ قوتیں میسر نہیں اس لئے اس قسم کا انقلاب ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہی وہ بنیادی نقطہ ہے جہاں سے "آنے والے" کا عقیدہ پیدا ہوتا ہے۔ آپ دنیا کی کسی تنزل پذیر قوم کو دیکھئے۔ اس میں "آنے والے" کا عقیدہ موجود ہوگا۔ ہندوؤں نے تو اسی عقیدہ کے ماتحت زمانے کو جگوں میں تقسیم کر دیا۔ اسلاف کا زمانہ "ست جگ" (دورِ صداقت) اور موجودہ زمانہ "کلجگ" (دورِ کذب و دنائت)۔ اس کے بعد وہ آخری زمانے میں "کلنکی اوتار" کے آنے کے منتظر ہیں جو کلجگ کو پھر ست جگ میں تبدیل کر دے گا۔ زرتشتی بھی متر اکی آمد کے منتظر ہیں۔ یہودی بھی ایک نجات دہندہ کی رجعت کے انتظار میں ہیں۔ عیسائی بھی ہر وقت نگاہیں آسمان کی طرف لگائے بیٹھے ہیں تاکہ وہ فارقلیط۔ وہ خدا کی برگزیدہ روح آئے اور دنیا کی نجات کا باعث بنے۔ (عیسائیوں سے مراد اُن کا مذہب پرست طبقہ ہے نہ کہ عام اقوامِ یورپ جو محض قومی اعتبار سے عیسائی ہیں نہ کہ مذہبی اعتبار سے)۔ اور ان سب کے ساتھ مسلمان بھی موجودہ زمانے کو

"چودھویں صدی" (کلجگ) یعنی "قربِ قیامت" کا زمانہ سمجھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک آنے والے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ بعض نے اس انتظار کے وقفے کو کم کرنے کے لئے ہر صدی پر ایک "مجدد" کے آنے کا عقیدہ وضع کر لیا اور اس طرح مسافت کی لمبائی کو نشاناتِ راہ سے بانٹ کر (کم از کم ذہنی طور پر) سفر کی کوفت کو کم کر لیا۔ یہی وہ نفسیاتی محرکات تھے جو ایران میں بہاء اللہ اور پنجاب میں نبوتِ جدیدہ کے موجب بنے۔ اور یہی وہ یاس انگیز کوائف تھے جن کی وجہ سے میرے دوست یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اب چارہ کار اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا کی طرف سے رسول آئیں اور وہ بھی ایک آدھ نہیں بلکہ درجنوں۔ (تعداد کی زیادتی کا تقاضا درحقیقت یاس و قنوطیت کی شدت کا غماز ہے)۔

پھر سن لیجئے کہ اس عقیدہ کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ جن اسلاف نے انقلاب پیدا کیا وہ مافوق البشر قوتوں کے حامل تھے اور چونکہ ہم بشریت کی سطح پر ہیں اسلئے ہم ایسا انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔

انسان کی اس نفسیاتی کیفیت، نوعِ انسان کی اس تاریخی شہادت، اور تمام مذہب پرست اقوام کے اس فریبِ نفس کو سامنے رکھئے اور اس کے بعد سوچئے کہ قرآن نے رسول اللہؐ سے اس شدت اور تکرار سے کیوں کہا کہ ان سے کہدو کہ انما انا بشر مثلکم۔ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ (فرق ہے تو فقط اس قدر جس کا ذکر ذرا آگے چل کر آتا ہے)۔ ذرا غور کیجئے کہ قرآن کو اس اعلان کی ضرورت کیا تھی؟ قرآن کا اولیں مخاطب طبقہ، نہ صرف یہ کہ اقوامِ سابقہ کے تتبع میں کہتا تھا کہ مالِ انت الا بشر مثلنا (تم تو صرف ہمارے جیسے ایک انسان ہو) بلکہ وہ حضورؐ کی بشریت کو بطور اعتراض پیش کرتے اور کہتے تھے کہ مالِ ھٰذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق (یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے)۔ لہٰذا ان سے یہ کہنا کہ "میں ایک بشر ہوں تمہارے جیسا" ان کے کسی تقاضے کی تسکین یا اعتراض کے جواب میں نہیں تھا۔ یہ درحقیقت اس بنیادی نقطے کے ابطال کے لئے تھا جس سے اقوامِ عالم اس مہلک غلط فہمی میں مبتلا ہو چکی تھیں کہ انقلاب وہی لا سکتا ہے جو مافوق البشر قوتوں کا حامل ہو۔ وہ "غلط فہمی" جس نے بڑی بڑی قوموں کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھدیا۔ قرآن نوعِ انسانی کو اس عظیم ہلاکت سے بچانا چاہتا تھا جس نے زندہ انسانوں کی بستیوں کو قبرستانوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ غور کیجئے کہ قرآن نے اس حقیقتِ کبریٰ کو کس بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی ہستی مافوق البشر قوتوں کی حامل ہو سکتی تھی تو مسلمانوں کے نزدیک ذاتِ رسالتمآبؐ ہی یقیناً ایسی ہستی ہو سکتی تھی لیکن اسی ذات کی زبانِ اقدس سے بار بار یہ کہلوایا گیا کہ قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیّ . . . .

ان سے کہدو کہ میں تمہارے جیسا ایک انسان ہوں۔ صرف اس فرق کے
ساتھ کہ میری طرف خدا کی طرف سے وحی ہوتی ہے۔

یعنی رسول اللہؐ کی ذات کے دو گوشے (یا دو پہلو) تھے۔ ایک وحی اور دوسری بشریت۔ وحی کے متعلق حضورؐ کو تاکید کر دی گئی کہ اسے دوسروں تک پہنچا دو (بلغ ما انزل الیک)۔ لہٰذا جب وحی کو دوسروں تک پہنچا دیا گیا تو رسول اور مومنین دونوں ایک ہی مقام

بشریت پر آگئے۔

اب اس انقلابِ عظیم کو دیکھئے جو رسول اللہؐ کے ہاتھوں رونما ہوا۔ اس انقلاب کیلئے رسول اللہؐ سے کہا گیا کہ تم اس وحی کی اتباع کرتے رہو جو تمہیں دی گئی ہے اور اسی کی اتباع اپنی جماعت سے کراؤ۔ اس کے سوا کسی اور نظریہ کسی اور مسلک اور کسی اور اصول کی اتباع مت کرو۔ لہٰذا انقلاب کے معنی یہ تھے کہ انسانوں کی ایک جماعت نے (جن میں خود رسول اللہؐ بھی بہ حیثیت ایک انسان کے شامل تھے) وحی کی اتباع کی اور انقلاب وجود میں آگیا۔ بنابریں انقلاب نتیجہ ہوا وحی کی اتباع کا۔ جو انسان اس کی اتباع کریں گے وہی انقلاب پیدا کر سکیں گے۔ اس کے لئے کسی مافوق البشر قوت کی ضرورت نہیں نہ کسی کو مافوق البشر قوت عطا ہوئی ہے۔ انقلاب قوتِ بشری کی رُو سے ظہور پذیر ہوتا ہے بشرطیکہ وہ قوت وحی کے متعین کردہ اصولوں کی اتباع میں صرف کی جائے۔

یہ تھا وہ بلیغ نکتہ جس کی وضاحت کے لئے قرآن نے بار بار اس حقیقت کا اعلان کیا کہ رسولؐ کی حیثیت (وحی سے ہٹ کر[1]) بشری کی حیثیت ہوتی ہے۔ مافوق البشر حیثیت نہیں ہوتی۔ نبی اکرمؐ نے ابلاغ وحی کے بعد جو کچھ کیا بشریت کی امکانی قوتوں کی بنا پر ہی کیا۔ اس میں کسی مافوق البشر قوت کا دخل نہیں تھا۔ آپ نے اس انقلاب (قرآنی معاشرہ کی تشکیل) کے لئے ایک پروگرام مرتب فرمایا۔ اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لئے اسباب و ذرائع فراہم کئے۔ فریقِ مقابل سے تصادمات ہوئے۔ فتح بھی ہوئی شکست بھی ہوئی۔ خود آپؐ کی اپنی ذات کو بھی تکالیف پہنچیں۔ میدانِ جنگ میں زخم بھی کھائے۔ یہ سب کچھ عام انسانوں کے طرق و انداز کے مطابق ہوا۔ اس میں کہیں مافوق البشریت نہ تھی۔ حتیٰ کہ اس تمام جدوجہد اور سعی و عمل میں وہ غلطیاں بھی ہوئیں جو بعض اوقات انسانی تدابیر میں ہو جاتی ہیں۔ ان کا اعتراف بھی کیا اور اس کے بعد ان کا ازالہ بھی انسانی تدابیر ہی سے کیا۔ خود قرآن میں اس قسم کے بعض تسامح پر تادیب بھی ہوئی۔ قرآن کریم نے آپ کی زندگی کے ان گوشوں کو ابدی طور پر محفوظ ہی اس لئے کیا ہے کہ آپ کی بشریت ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہے اور کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہونے پائے کہ وحی کے بعد عملی انقلاب کے لئے مافوق البشر قوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے بھی کہدیا کہ یہ انقلاب تنہا محمد رسول اللہؐ کی جدوجہد کا نتیجہ نہ تھا بلکہ آپؐ کے ساتھ آپ کے رفقائے کار بھی اس میں برابر کے شریک تھے۔ محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے الفاظ اس حقیقت کی بدیہی شہادت ہیں۔ اس سے بھی یہی ظاہر کرنا مقصود تھا کہ یہ انقلاب انسانوں ہی کی ایک جماعت کے ہاتھوں رونما ہوا تھا۔ اس کے لئے مافوق البشر قوتوں کی ضرورت نہ تھی۔ اس جماعت کی خصوصیت صرف اس قدر تھی کہ وہ خالص وحی کی اطاعت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ اگر خود نبی اکرمؐ بھی کسی وقت کوئی حکم دیتے تو افرادِ جماعت یہ دریافت کر لیتے کہ وہ حکم وحی کی بنا پر ہے یا آپ کا ذاتی ارشاد ہے۔ اور ذاتی ارشاد کی صورت میں اس حکم کو صرف ایک رائے (ADVICE) کی حیثیت دی جاتی۔ خود قرآن اور تاریخ میں اس قسم کے واقعات کا ذکر موجود ہے۔ دوسری طرف نبی اکرمؐ کو مکلف ٹھہرایا گیا کہ آپ اس تحریک انقلاب (قرآنی معاشرہ کی تشکیل) سے متعلقہ امور میں

---

[1] وحی کس طرح مافوق البشر چیز ہے یہ ایک الگ بحث ہے جس کی تشریح کا یہ مقام نہیں۔

اپنی جماعت سے مشورہ کر لیا کریں (وشاورھم فی الامر)۔ اس کے بعد اور کس شہادت کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے۔ یہ سمجھنے یا سمجھانے کے لئے کہ وحی کے بعد تمام امور میں آپ کی حیثیت بشر کی تھی اور انسانوں کی اسی جماعت نے (جس میں خود آپ بھی شامل تھے) بشری قوتوں کی بنا پر وہ انقلاب عظیم پیدا کر دیا تھا جو آج ہمارا مطلوب و مقصود ہے، لیکن جس کے حصول کو ہم آج اس بنا پر ناممکن سمجھتے ہیں کہ ہم نے (بزعم خویش) سمجھ لیا ہے کہ اس انقلاب کے لئے مافوق البشر قوتوں کی ضرورت ہے لہٰذا اس کے لئے کوئی مجدد، کوئی مہدی، کوئی مسیح اور کوئی رسول ہی آئیگا تو کام بنے گا۔ اس مقام پر اتنی وضاحت اور ضروری ہے کہ میں بھی مختلف افراد کی بشری قوتوں کے تفاوت کو تسلیم کرتا ہوں (یہ تفاوت کیوں ہوتا ہے اور اسے کس طرح کم کیا جا سکتا ہے یہ ایک الگ موضوع ہے جس کی تفصیل کا یہ مقام نہیں) لیکن میں جو کچھ کہتا ہوں وہ صرف اس قدر ہے کہ جس انقلاب کو ہم اپنی زندگی کا درخشندہ نصب العین قرار دیتے ہیں وہ انقلاب بشری قوتوں سے عمل میں آیا تھا اور جو انقلاب ایک مرتبہ بشری قوتوں سے عمل میں لایا گیا تھا۔۔۔ وہ دوسری بار بھی بشری قوتوں سے عمل میں آسکتا ہے۔ بشری قوتوں کے اجاگر ہونے اور اس کے بعد ایک نقطہ پر مرکوز ہو کر شدت سے مؤثر بننے کا ۔۔۔ بنیادی اصول یہ ہے کہ نصب العین کی صداقت پر یقین محکم اور اس کے حصول کے لئے دل میں تڑپ ۔۔۔ وہ جماعت جس کا ہم اوپر ذکر کرتے چلے آرہے ہیں (یعنی محمد رسول اللہ والذین معہ) ان کے دل میں یہی یقین اور تڑپ تھی جس نے ان کی قوتوں کو اس درجہ نتیجہ خیز بنا دیا تھا۔ لیکن یہ چیز بھی مافوق البشر نہیں تھی۔ یہ ایمان ہر وقت پیدا کیا جا سکتا ہے۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اپنے نصب العین کی صداقت پر محکم یقین رکھیں۔ اور اسی یقین محکم سے وہ تڑپ پیدا ہوتی ہے جو عمل پیہم کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ لہٰذا یہ سب قوتیں حیطۂ بشریت کے اندر کی ہیں۔ بنا بریں، ذرا سوچئے کہ وہ کونسی چیز ہے جو ہمارے اسلاف کے پاس تھی اور ہمارے پاس نہیں ہے جس کے لئے ہمیں کسی مافوق البشر قوتوں کے حامل انسان کی آمد کا انتظار ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے رسول اللہؐ کی بشریت پر اس قدر زور دیکر دنیا میں مقام بشریت کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ اس سے قبل اس کا تصور بھی نہیں آسکتا تھا۔ مسلمان ہی نہیں، بلکہ دنیا بھر کے مفکر و مورخ اس حقیقت کی شہادت دیتے ہیں کہ جو انقلاب نبی اکرمؐ نے برپا کیا اس کی مثل و نظیر تاریخ انسانیت میں کہیں نہیں ملتی اور اس کے مقابل، قرآن کریم نے بار بار اعلان کر دیا کہ جس شخصیت کے ہاتھوں یہ انقلاب رونما ہوا وہ ایک بشر تھا۔ لہٰذا قرآن نے بالفاظِ دیگر یہ بتا دیا کہ وہ انقلاب جسے تم اسقدر تحیر انگیز قرار دیتے ہو اس کا امکان حیطۂ بشریت کے اندر ہے۔ دیکھئے کہ اس سے امکاناتِ بشریہ کا دائرہ کس قدر وسیع اور اس کا مقام کس قدر بلند ہو گیا۔ رسول اللہؐ کا بشر ہونا، شرفِ بشریت کی دلیل اور سربلندئ آدم کی شہادت ہے۔ اس سے ہر فردِ انسانیہ کے دل میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے اور خود اعتمادی، عروج آدمیت کی اولیں اور بنیادی شرط ہے۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لئے قرآن نے بار بار آپؐ کی بشریت کو نمایاں کیا۔ ۔ ۔ اور خود حضورؐ نے اپنی تعلیم اور عمل سے اپنے رفقائے کار کے دل میں اس حقیقت کو ثبت کر دیا کہ (ابلاغِ وحی کے بعد) آپؐ کی حیثیت ایک بشر کی ہے۔ لہٰذا جو کچھ حضورؐ نے کیا ۔۔۔ وہ حضورؐ کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اسی نقطہ کی وضاحت کے لئے قرآن نے کہدیا کہ وما محمد الا رسول ۔۔ ۔۔۔ آپؐ کی حیثیت ایک پیغام رسانی کی ہے۔ اس قسم کے پیغام رساں حضرات آپ سے پہلے بھی آئے تھے۔ جو انقلاب آپ نے

پیدا کیا ہے وہ اسی پیغام (وحی) کی روشنی میں بشری قوتوں کی بنا پر کیا ہے۔ اس لئے آپ کی وفات کے بعد (وحی کی موجودگی میں) کسی ایسی چیز کی کمی نہیں واقعہ ہو جائے گی جو اس انقلاب کے لئے ناگزیر ہو۔ لہٰذا تم کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ اب رسول تو ہم میں ہیں نہیں اسلئے یہ انقلاب بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ اس لئے ہمیں پھر اپنی پہلی حالت کی طرف لوٹ جانا چاہئے (یہ قرآنی آیت کا ترجمہ ہے)۔ یہی وہ آیت تھی جسے حضرت ابوبکرؓ نے حضورؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے سامنے پیش کر کے ان کی توجہ اس طرف مبذول کرائی تھی کہ آپ کی وفات سے اس نظام میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ نظام کا قیام وحی کی اتباع سے ہے اور وحی ہمارے پاس اپنی مکمل شکل میں موجود ہے۔

یہی وحی (قرآن) آج ہمارے پاس بھی اپنی مکمل اور اصلی شکل میں موجود ہے اس لئے اس کی روشنی میں پھر وہی انقلاب لایا جاسکتا ہے، جو محمد رسول اللہ والذین معہٗ کے ہاتھوں وجود پذیر ہوا تھا۔ قرآن نے "ہبوطِ آدم" (پستیوں میں گرے ہوئے انسانوں) کا علاج، وحی کی اتباع میں بتایا ہے نہ کہ مافوق البشر قوتوں کے حصول (یا انتظار) میں۔ اس نے "جنت سے نکلے ہوئے آدم" سے یہی کہا تھا کہ تو اپنے تنزل پر غمگین نہ ہو۔ تجھ میں وہ تمام قوتیں موجود ہیں جو پستیوں کو بلندیوں میں تبدیل کر دینگی۔ بس اس ایک اصول کو یاد رکھو کہ اما یاتینکم منی ھدیً۔ فمن تبع ھدای فلا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ "ہماری طرف سے تمہارے پاس ضابطۂ راہ نمائی آئے گا۔ جو اس کی اتباع کرے گا اسے کسی قسم کا خوف و حزن نہیں ہوگا"۔

آج ہمارے پاس وہ ضابطۂ راہنمائی بھی موجود ہے لیکن اس کے باوجود ہمارا خوف و حزن، یقین اور اطمینان میں نہیں بدلتا۔ اس لئے کہ ہمارا ایمان خدا کے اس فرمان پر نہیں . . . کہ انقلاب اس ضابطہ کی اتباع سے رونما ہوگا۔ ہمارا ایمان تو اس واہمہ پر ہے کہ انقلاب، مافوق البشر قوتوں کے بغیر ناممکن ہے۔ خدا وہ کچھ کہتا ہے۔ ہم یہ کچھ کہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ ہم اپنی غلط نگہی سے غلط تصورات تو قائم کر سکتے ہیں لیکن . . . خدا کے قانون کے نتائج و عواقب سے نہیں بچ سکتے۔ اس کا قانون یہی ہے کہ انقلاب (وحی کی روشنی میں) بشری قوتوں سے رونما ہوگا۔ جو قوم اسے مافوق البشر قوتوں سے وابستہ سمجھتی ہے وہ ہمیشہ پستیوں میں گری رہے گی۔ دیکھئے! دنیا کی تاریخ (مسلمانوں سمیت) کس طرح پکار پکار کر خدا کے قانون کی پائندہ شہادت بہم پہنچا رہی ہے۔

ان کنتم تعلمون

(نذر الباقر)

حقائق و عبر

۱۔ یہ بھی شریعت

"قرآن حکیم تمام آسمانی کتابوں سے صراحت کے ساتھ اس کا اعلان کرتا ہے کہ حاکم مطلق بجز اللہ کے اور کوئی نہیں۔ . . . . اس لئے کسی انسان پر کسی دوسرے انسان کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ قرآن کے نزول کا اصل مقصد یہی ہے کہ انسان کی گردن سے غیر اللہ کی اطاعت کا قلادہ نکال دے اور اللہ یعنی مطاع حقیقی کا بندہ بنانے کے بعد اس کی رائے اور ضمیر کی پوری پوری آزادی عطا کر دے۔ چنانچہ انسانی غلامی کے خلاف سب سے بڑھ کر جس کتاب نے جہاد کیا ہے وہ قرآن ہی ہے۔ . . . . یہ مقدمہ ذہن نشین کر لینے کے بعد اب اس امر کی تحقیق کیجئے کہ نبی کی اطاعت جو اسلام میں فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے یہ کس حیثیت سے ہے۔ یہ اطاعت اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ وہ نبی خاص شخص مثلاً ابن عمران یا ابن مریم یا ابن عبداللہ ہے۔ قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم ہو۔ . . . . اسی لئے اللہ تعالیٰ بار بار اپنے نبی سے اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ اطاعت جو مومن پر فرض کی گئی ہے دراصل نبی بہ حیثیت انسان کی اطاعت نہیں ہے بلکہ نبی بہ حیثیت نبی کی اطاعت ہے۔ یعنی اس علم، اس ہدایت، اس حکم اور اس قانون کی اطاعت ہے، جسے اللہ کا نبی، اللہ کی طرف سے، اس کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ . . . . اسلام آیا ہی اسلئے ہے کہ غیر اللہ کی بندگی اور انسان پر انسان کی خداوندی کا قلع قمع کر دے۔ اور اگر کوئی انسان خدا کا نہیں، خود اپنا کوئی خیال پیش کرے تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم رکھنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کو آزادانہ اتفاق کرنے کا بھی اختیار ہے اور آزادانہ اختلاف کرنے کا بھی۔ اس معاملہ میں علماء اور ائمہ اور حکام تو درکنار، خود نبی کی ذاتی رائے سے بھی اختلاف کرنے میں کوئی چیز مانع نہیں۔"

(ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۶ء)

اور یہ بھی

"لیکن یہ تفریق جو انھوں نے (علامہ اسلم جیراجپوری نے) محمد ابن عبداللہ بحیثیت انسان اور محمد رسول اللہ بحیثیت مبلغ کے درمیان کی ہے قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں۔ قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے اور وہ رسول و نبی ہونے کی حیثیت ہے۔ جس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب رسالت سے سرفراز کیا اس وقت سے لیکر حیاتِ جسمانی کے آخری سانس تک آپ ہر آن اور ہر حال میں خدا کے رسول تھے۔ آپ کا ہر فعل اور ہر قول رسولِ خدا کی حیثیت سے تھا۔ . . . حتیٰ کہ آپ کی نجی اور شہری زندگی کے سارے معاملات بھی اسی حیثیت کے تحت آ گئے تھے۔ . . . . قرآن کریم میں کوئی خفیف سے خفیف اشارہ سے بھی ایسا نہیں ملتا جس کی بنا پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسان اور حیثیتِ امارت میں کوئی

فرق کیا گیا ہو۔" (ابوالاعلیٰ صاحب مودودی، تفہیمات حصہ اول۔ صفحہ ۲۴۱)

پھر سُن لیجئے کہ بات کیا ہوئی!

(۱) اسلام میں جو نبی کی اطاعت فرض کی گئی ہے اور جس پر دین کا مدار ہے وہ اس حیثیت سے ہرگز نہیں کہ وہ نبی خاص شخص مثلاً محمدؐ ابن عبداللہ ہے۔ وہ اطاعت نبی بہ حیثیت نبی کی ہے	(۱) محمدؐ ابن عبداللہ بہ حیثیت انسان اور محمدؐ رسول اللہ بہ حیثیت مبلغ کی تفریق قرآن مجید سے ہرگز ثابت نہیں قرآن میں آنحضرتؐ کی ایک ہی حیثیت بیان کی گئی ہے وہ رسول دینی کی حیثیت ہے۔
(۲) قرآن نے اس مسئلہ کو نہایت واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ذاتی حیثیت میں تو نبی ویسا ہی ایک بشر ہے جیسے تم ہو۔	(۲) قرآن کریم میں کوئی خفیف سا خفیف اشارہ بھی ایسا نہیں ملتا جس بنا پر آنحضرتؐ کی حیثیتِ رسالت اور حیثیتِ انسانی میں کوئی فرق کیا گیا ہو
(۳) نبی کی ذاتی رائے سے اختلاف کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہو سکتا۔	(۳) نبی کی ذاتی رائے ہوتی ہی نہیں کیونکہ اس کا ہر قول اور ہر فعل رسولِ خدا کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

۲۔ نیز یہ بھی

"اگر کوئی انسان، خدا کا نہیں خود اپنا کوئی خیال پیش کرے تو مسلمان پر اس کی اطاعت فرض نہیں۔ وہ آزادی کے ساتھ خود سوچنے اور رائے قائم کرنے کا حق رکھتا ہے۔"

(ترجمان القرآن بابت دسمبر ۱۹۳۶ء)

اور یہ بھی

"فقہائے اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ دادا کی موجودگی میں جس پوتے کا باپ مر گیا ہو وہ وارث نہیں ہوتا بلکہ وارث اس کے چچا ہوتے ہیں۔ . . . . اگرچہ ابھی تک مجھے قرآن و حدیث میں کوئی ایسا صریح حکم نہیں ملا[1] جسے فقہا کے اس متفقہ فیصلے کی بنا قرار دیا جا سکے لیکن بجائے خود یہ بات کہ فقہائے امت، سلف سے خلف تک اس پر متفق ہیں، اس کو اتنا قوی کر دیتی ہے کہ اس کے خلاف کوئی رائے دینا مشکل ہے۔" (ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۲ء)

۳۔ بلا تبصرہ

"یہ منکرین حدیث دراصل جہل مرکب میں مبتلا ہیں جس چیز کو نہیں جانتے اسے جاننے والوں سے پوچھنے اور سمجھنے کی بجائے عالم بن کر فیصلہ صادر کرتے ہیں اور پھر انہیں شائع کر کے عوام الناس کو گمراہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی گمراہ کن تحریریں

---

[1] اس مسئلہ کی بابت قرآن کا کیا حکم ہے، اس کے متعلق تفصیل سے بعد میں لکھا جائے گا۔ طلوع اسلام۔

اکثر ہماری نگاہ سے گذرتی رہتی ہیں اور ان کا کوئی اعتراض ایسا نہیں جس کو دلائل سے رد نہ کیا جا سکتا ہو لیکن جس وجہ سے مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑتی ہے وہ دراصل یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی بحث میں بالعموم بازاری غنڈوں کا سا طرز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے مضامین پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی شخص ایک غلاظت بھری جھاڑو ہاتھ میں لئے کھڑا ہو اور زبان کھولنے کے ساتھ ہی مخاطب کے منہ پر اس جھاڑو کا ایک ہاتھ رسید کر دے۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کے منہ لگنا کسی شریف آدمی کے بس کی بات نہیں ہے اور نہ اس قماش کے لوگ اس لائق سمجھے جا سکتے ہیں کہ ان سے کوئی علمی بحث کی جائے۔" ! (ابو الاعلیٰ صاحب مودودی۔ ترجمان القرآن بابت مارچ ۱۹۵۲ء)

قدم بہ قدم

اس کے ساتھ ذرا اس عبارت کو بھی ملا کر پڑھ لیجئے :۔

"قادیان میں ایک بدگو مخالف آیا ہوا تھا جس نے حضرت کے خدام میں سے ایک کو اپنے پاس بلا بھیجا جو اس کے ساتھ گفتگو کرنے چلا گیا۔ جب اس امر کی حضرت مسیح موعود کو خبر ملی تو آپ نے فرمایا کہ ایسے خبیث مفسد کو اتنی عزت نہیں دینی چاہیئے کہ اس کے ساتھ تم میں سے کوئی بات چیت کرے۔" (ملفوظات احمدیہ حصہ چہارم ص۱۴۵) ۔۔۔ "حیرت ہے کہ ان لوگوں (یعنی میرزا صاحب کے مخالفین) کو نجاست خواری کا کیوں شوق ہو گیا۔" (ارشاد میرزا صاحب مندرجہ تبلیغ رسالت جلد دوم۔ ص۹۲)

۴۔ شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا

ہمارے علمائے کرام کا سرمایۂ علم کیا حیثیت رکھتا ہے، اس کے متعلق طبقۂ علماء کے سرخیل، ابو الکلام صاحب آزاد کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیے۔ وہ تذکرہ میں لکھتے ہیں :۔

ایک بزرگ کہ درس و تدریس معقولات کے لحاظ سے آج کل مخصوص امتیازی درجہ رکھتے ہیں، ایک دن اسی لب و لہجہ میں جو ان بزرگوں کیلئے مخصوص ہے آج کل کے انگریزی تعلیم یافتہ اشخاص کی مذہب سے بے خبری اور الحاد و بیدینی کی شکایت کرنے لگے۔ میں نے کہا یہ شکایت کم از کم آپ لوگوں کی زبانی تو اچھی نہیں معلوم ہوتی میرے خیال میں تو آپ اور وہ دونوں ایک ہی تنور کے سوختہ اور ایک ہی مشرب و مسلک کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ آپ کی قدامت و اولیت کی رعایت کرتے ہوئے ان کو آپ کا چھوٹا بھائی کہا جائے۔ آپ یونانیوں کے حلقہ بگوش، وہ یورپ کے پرستار۔ قرآن و سنت سے آپ بھی دور و مہجور، وہ بھی بے خبر و نفور۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ایک لحاظ سے آپ پر وہ فضیلت رکھتے ہیں۔ آپ کے ائمہ و پیشوا فلاسفۂ یونان ہیں جن کا قدم ذہنیات ضالہ سے آگے نہ بڑھا۔ ان کے معبودانِ علم فلاسفۂ یورپ ہیں جنھوں نے بہر حال دنیا کے آگے تجربۂ استقراء اور کشفیاتِ علمیہ کا دروازہ کھولا۔ ان میں کا ایک لڑکا جو اسکول کی پانچویں کلاس میں سائنس او طبیعیات کی ریڈر پڑھتا ہے شاید آپ کے مدارس کے ان منتہیوں سے زیادہ صحیح راہ پر ہے جو صدرا و شمس بازغہ سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ آپ صاحبوں میں مترجمین اور ناقلین عرب تھے جنھوں نے یونانیات کو عربی کا جامہ پہنا کر مقدس بنایا تھا اور معتزلہ اور اخوان الصفا وغیرہم پیدا ہو گئے جنھوں نے مصطلحات و عبائر یونانیات کو علوم دینیہ میں امتزاج و خلط کیمیائی کے ساتھ ملا دیا لیکن ان بیچاروں کو یہ اتفاقات اب تک نصیب نہیں ہوئے۔ معاملہ سرسید اور ان کی خوشہ چینیاں غیر معترف و مقلدین غیر مقر یا مجتہدین فی المذہب سے آگے نہیں بڑھا۔ اگر ان میں بھی کوئی اس ڈھب کا نکل آتا تو آپ دیکھتے کہ ان کے مباحث خاص آپ کے امر عام سے تو ضرور بازی لیجاتے۔ کم از کم آپ حضرات کو تو اس معاملہ میں خاموش ہی رہنا چاہیئے ۔۔۔۔۔۔ [illegible]

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ وہ تنہا ادارہ ہے جو گراموفون ریکارڈ کے ذریعہ سے نئی زبان سکھاتا ہے۔

زبان وہ سیکھئے
جو اہلِ زبان بولتے ہیں

نصابی کتابوں سے آپ "کوئی غیر ملکی زبان" بولنے کا صحیح طریقہ نہیں سیکھ سکتے۔ اس کے لئے ضروری ہے آواز کا وہ انداز اور اتار چڑھاؤ اور کلام کا وہ لب و لہجہ جو عموماً روزمرہ کی بول چال میں اہل زبان کام میں لاتے ہیں۔ لنگوافون سے یہ چیزیں بہت جلد پوری طرح اور بغیر محنت و کوشش کے ذہن نشین ہو جائیں گی۔

کوئی زبان سیکھنے کے لئے عموماً جتنا وقت درکار ہوتا ہے لنگوافون اس کی نصف مدت میں آپ کو وہ زبان بولنے، پڑھنے اور لکھنے کے قابل بنا دیتا ہے، اور یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ دشوار کام یعنی بولی سن کر سمجھ لینے کی مہارت پیدا کر دیتا ہے۔

اس طریقہ تعلیم میں درس و تدریس کے منجمد قواعد و ضوابط نہیں ہیں بلکہ شروع ہی سے آپ کو روزمرہ بول چال کے ایسے ماحول میں رکھ دیا جاتا ہے جو ٹھنڈی سڑکوں، قہوہ خانوں، یا سیر گاہوں میں پایا جاتا ہے۔ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کیجئے اور چند ماہ میں آپ اپنی دلپسند زبان میں آزادانہ اظہار خیال کر لینے پر قادر ہو جائیں گے۔ زبان سیکھنے کے لئے اس اچھوتے اور جدید طریقے کے متعلق پوری معلومات حاصل کیجئے۔ مندرجہ ذیل کوپن ڈاک میں ڈال دیجئے۔ فوراً تفصیلی جواب دیا جائے گا۔

زبان سیکھنے کیلئے لنگوافون

اردو	انگریزی	فارسی
عربی	بنگالی	ہندوستانی
فرانسیسی	روسی	چینی
اسپینش	اطالوی	ڈچ
سویڈش	نارویجن	فنش
زرچ	پولش	لاطینی
یونانی	ایفک	ملائے
ہوسا	آئس لینڈک	سواحلی
جرمن	ترکی	پرتگالی

اپنی پسند کردہ زبان کے آگے چوپارہ (×) بنا دیجئے اور نیچے غرض یا وجہ لکھئے۔

زبان سیکھنے کی وجہ یا غرض .....

نام .....

پتہ .....

جنرل سکریٹری صاحب،

لنگوافون انسٹی ٹیوٹ متصل گرانڈ ہوٹل میکلوڈ روڈ۔ کراچی

براہِ مہربانی اپنی تفصیلی کتاب جس میں لنگوافون اور ہفتہ بھر کی مفت آزمائش کے متعلق وضاحت درج ہے، بھیج دیجئے۔

میرے پاس گراموفون باجہ موجود ہے / نہیں ہے۔

THE ANGLO-THAI CORPORATION LTD.

(Incorporated in England)

(EWART RYRIE BRANCH)

Importers, Exporters & General Merchants

Nadir House, McLeod Road

KARACHI

BRANCHES:—

BANGKOK.

SINGAPORE.

BOMBAY.

KUALA LUMPUR.

PENANG.

Agents for:—

Howards & Sons Ltd., Ilford, London.—
QUININE SALTS & FINE CHEMICALS.

Stafford Allen & Sons Ltd., London.—
MANAUFACTURING CHEMICALS.

J. R. Geigy, Basle.—*Insecticides.*—
DYES & PHARMACEUTICALS.

Eli Lilly International Corporation, Indianapolis (U.S.A.).—
PHARMACEUTICALS.

H. Bronnley & Co. Ltd., London.—
TOILET REQUISITES.

London Varnish & Enamel Co. Ltd., London.—
PAINTS & VARNISHES Etc., Etc.

FIRDAUS TRADING CORPORATION

Clearing & Forwarding Agents

and

Cotton Merchants

*

SERAI ROAD,
KARACHI

فردوس ٹریڈنگ کارپوریشن

کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنٹس اینڈ کاٹن مرچنٹس

سرائے روڈ۔ کراچی

FORVIL PRODUCTS are the best, try once any Forvil Products every product is highly perfumed with flowers smell admired by high society peoples.

Sole Agents :—

THE UNITED PERFUMERS

23, LAXMI BUILDING, BUNDER ROAD,

KARACHI.

Regd. No. S. 1089.

Bengal Oil Mills Ltd.

provides for:

Both

INTERNAL & EXTERNAL CLEANLINESS BY PRODUCING

Highly Vitaminised
&
Nutritive Cooking Oil

**High Class
Washing Soap which
Cleanses Clothes 'Milky White'**

BENGAL OIL MILLS LTD.

Pakistan's Premier Oil & Soap Mills

(Inaugurated by QUAID-E-AZAM)

P. O. BOX No. 132
KARACHI-2

Telephone: Office: 3336; Mills: 2008